رجسٹرڈ نمبر اے ۶۶۴

نگار

ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ
قیمت فی کاپی ۱۰ر

سالانہ چندہ پاکستان و ہندوستان
آٹھ روپیہ (مع سالنامہ)

تصانیف نیاز فتحپوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے والی انجیل انسانیت

من و یزداں

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو "انسانیتِ کبریٰ و اخوتِ عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقائد، رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے

ضخامت ۶۰۲ صفحات مجلد نو روپیہ ۹ لئہ علاوہ محصول

مذہبی استفسارات و جوابات کا مجموعہ

اس مجموعہ میں جن مسایل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے ۱۔ اصحاب کہف۔ معجزہ و کرامت انسان مجبور ہے یا مختار۔ مذہب و عقل۔ طوفان نوح۔ خضر کی حقیقت۔ مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں۔ یونس و وہان ہی حسن یوسف کی داستان۔ قارون۔ سامری۔ علم غیب۔ دعا توبہ۔ لقمان۔ عالم برزخ۔ یاجوج ماجوج۔ ہاروت ماروت حوض کوثر۔ امام مہدی۔ نور محمدی اور پل صراط۔ آتش نمرود وغیرہ

ضخامت ۳۴۲ صفحات کاغذ سفید۔ نرخ قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ آٹھ آنہ

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے، اسلئے ضخامت بھی زیادہ ہے

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان ندرت خیال اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسائل کا حل بھی نظر آئیگا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے

قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بکھرے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنھیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

ترغیبات جنسی یا شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات پر تاریخی و نفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج کتنی مدد کی اس کتاب میں آپکو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ نیا اڈیشن

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

"نگار" کا آیندہ سالنامہ

مئی اور جون کے نگار میں ہم کافی وضاحت کے ساتھ بتا چکے ہیں کہ نگار کا آیندہ سالنامہ

"فرمانروایانِ اسلام" نمبر کیا، اور کیسا ہوگا

اور اس کی بعض خصوصیات کو بھی ظاہر کر چکے ہیں، لیکن اس خیال سے کہ ممکن ہے بعض حضرات اس کی اہمیت کا اندازہ نہ کر سکے ہوں، ہم مکرر اس کی اہمیت کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں

یہ سالنامہ در اصل "تاریخ اسلامی" کا نچوڑ ہوگا، جس میں ولادتِ رسول اللہ سے لیکر اسوقت تک کی تمام چھوٹی بڑی مسلم حکومتوں کا ذکر ہوگا جو ۱۳ سو سال کے اندر تمام کرۂ ارض پر رونما ہوکر فنا ہوگئیں یا اب بھی باقی ہیں۔ اس میں ان تمام حکومتوں کے اسباب قیام و عروج اور انحطاط و انفتام کے ذکر کے ساتھ تمام حکمرانوں کے نام، ان کی حکومت کی مدت بقید سن ہجری و عیسوی درج ہوگی اور یہ بتایا جائیگا کہ ایک ہی خاندان سے اور کتنے خاندان پیدا ہوئے، انھوں نے کہاں کہاں حکومتیں کیں اور ان کا کیا حشر ہوا مسلمان اپنے زمانۂ عروج میں یورپ، ایشیا، افریقہ کے ان بعید ترین گوشوں تک پہونچ گئے تھے جن کا آج تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، لیکن اس کا علم بہت کم حضرات کو ہے۔ نگار کے اس سالنامہ کے ذریعہ سے تاریخ اسلام کی انھیں مفید و دلچسپ معلومات کو پیش کیا جائے گا۔ اس کے ساتھ دو نقشے ایسے پیش کئے جائیں گے جن کو دیکھ کر مسلمانوں کے عروج و زوال کی تصویر آپ کے سامنے آجائے گی

یہ پورا سالنامہ خود اڈیٹر نگار مرتب کر رہے ہیں اور امید ہے کہ ہم پہلی جنوری ۱۹۵۴ء تک اسے شایع کرسکیں گے اس کی ضخامت کا صحیح اندازہ ابھی نہیں ہوسکتا۔ اس کی بابت غالباً ہم کچھ کہ سکیں گے۔ امید ہے کہ آپ اس کی توسیع اشاعت میں ضرور حصہ لیں گے اور اپنے حلقۂ احباب، مدارس کے طلبہ و اساتذہ کو بھی اس سالنامہ کی اہمیت کی طرف متوجہ کریں گے۔

یہ سالنامہ در اصل ایک مستقل کتاب ہوگی اور کتاب ہی سمجھ کر اس کو حاصل کرنا چاہئے

جو حضرات نگار کے خریدار نہیں ہیں اور صرف سالنامہ ہی لینا چاہیں گے ان کے لئے اس کی قیمت (علاوہ محصول ڈاک) تین روپیہ ہوگی۔

ایجنٹوں کو اپنا آرڈر جلد دیدینا چاہئے تاکہ اسی حساب سے اس کی کاپیاں زاید طبع کرائی جائیں۔

منیجر نگار لکھنؤ

شہوانیات یا ترغیبات جنسی

فہرست مضامین ملاحظہ ہو:-

فحاشی کی تعریف — فحاشی کی ابتدا اور اس کے اسباب — شادی — اقسام ازدواج — شادی کی مختلف صورتیں — طلاق وخلع — طلاق مختلف ممالک میں — مذہبی فحاشیاں — مذہب میں رواج فحاشی کے اسباب — مذہبی فحاشیوں کے عجیب و غریب قوانین — مذہبی فحاشیوں کی مرموز علامتیں — فحاشی پر عمومی تبصرہ — محافل نشاط — عید الحمقاء — عصمت فروشی وحشی اقوام میں — مقدس مباشرت — فحاشی ممالک مشرق میں — مسیحیت کا اثر فحاشی پر — قرون وسطیٰ کے ادارات فحاشی — اعلیٰ معیار کی پیشہ ورعورتیں — یوروپ کی بعض تاریخی پیشہ ورعورتیں — قحبگی علم الحیوٰۃ کے نقطۂ نظر سے — قحبگی کا اخلاقی پہلو — فحاشی کا اثر تمدن پر — استلذاذ بالمثل — استلذاذ بالمثل اقوام قدیمہ میں — استلذاذ بالمثل کے مختلف نظریئے — استلذاذ بالمثل اور بعض مشہور افراد — عورتیں اور استلذاذ بالمثل — استلذاذ بالوحوش — استلذاذ بالنفس جانوروں میں — استلذاذ بالنفس انسانوں میں — استلذاذ بالنفس کی قدیم تاریخ — فحاشی عہد قدیم میں — فحاشی قرونِ وسطیٰ میں — عہدِ جدید اور فحاشی — اخلاق جنسی وغیرہ وغیرہ -

قیمت علاوہ محصول چار روپیہ (للعہ)

مجموعہ مذہبی استفسارات وجوابات

فہرست مضامین ملاحظہ ہو:-

اصحاب کہف — کرامات غوث الاعظم — معجزہ وکرامات سے انکار — معجزہ وکرامات — انسان مجبور ہے یا مختار — مذہب وعقل — طوفان نوح — خضر علیہ السلام — حضرت عیسیٰ علیہ السلام — یونس علیہ السلام — قرآن اور اس کا جغرافیہ — حُسنِ یوسفی — وہی یوسف وہی افسانۂ حُسن — قارون اور اس کی دولت — مسئلہ معاد — تفکر فی القرآن — سامری — علم غیب — حقوق اللہ وحقوق العباد — وحی کی حقیقت — تعدد ازدواج — دُعا اور توبہ — نفس و روح — مسیح علم وتاریخ کی روشنی میں — لقمان — عالمِ برزخ — یاجوج ماجوج، ذوالقرنین — ہاروت ماروت — کوثر — مسیح کا دوبارہ زندہ ہونا — حدیث پر تاریخی وفنی گفتگو — مذہب ومذہبیات — امام مہدی — نورِ محمدی اور پل صراط — لفظ اُمّی کا صحیح مفہوم — سیرۃ نبوی — آدم اور شجر ممنوعہ — عقل ومذہب — کیا ہندوستان میں زکوٰۃ ادا کیا جانا واجب ہے — علامۂ مشرقی اور قبلہ کا رخ — آتشِ نمرود — قرآن وحدیث کی زبان کا فرق — اسلام اور کنیزیں -

قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ آٹھ آنے (صہ)

دونوں کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے پر معہ محصول صرف نو روپے (للعہ)

قول فیصل

جس میں ملک کے مشہور مفکر و بلند خیال شاعر علی اختر اختر حیدرآبادی نے جوش کی مشہور نظم "حرف آخر" کو سامنے رکھ کر اسکے تمام خیالات کی تردید کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ انسان لاکھ ترقی کرے کتنی ہی عقل وفراست سے کام لے لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے جب اس کو خدا کے سامنے سر جھکانا ہی پڑتا ہے۔ فنی حیثیت سے اختر کا یہ وہ عظیم الشان کارنامہ ہے جسے انکے شاعرانہ عروج کے ثبوت میں بآسانی پیش کیا جاسکتا ہے۔ شروع میں حضرت نیاز فتحپوری کا مقدمہ بھی شامل ہے۔ کاغذ ۲۸ پونڈ دبیز گردپوش رنگین۔ قیمت دو روپیہ

مالہ وما علیہ

جوش، جگر، سیماب وغیرہ بڑے مشہور شاعر ہیں لیکن کبھی کبھی وہ بھی ایسی فاش غلطیاں کرجاتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے -

حضرت نیاز نے انھیں مشہور شاعروں کی بعض نظموں اور غزلوں پر تبصرہ کرکے بتایا ہے کہ فن شعر کتنا نازک فن ہے اور بڑے سے بڑا شاعر کبھی نہ کبھی اس میدان میں ٹھوکر کھا جاتا ہے -

سرورق رنگین - قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

دونوں کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے پر معہ محصول صرف تین روپے (سے)

عورت اور تعلیمات اسلام — (مالک رام - ام - اے) — قیمت تین روپیہ علاوہ محصول — رعایتی قیمت ڈھائی روپیہ معہ محصول

منیجر نگار لکھنؤ

داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی کہ آپ کا چندہ جولائی میں ختم ہوگیا اور اگست کا "نگار" آٹھ روپیہ سات آنے میں وی پی ہوگا جس میں سالنامہ ۵۴ء کی قیمت بھی شامل ہے

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۶۴ | فہرست مضامین جولائی سنہ ۱۹۵۳ء | شمارہ ۱

ملاحظات - - - - - - - - ۳
جوش کی انقلابی شاعری - - - - کلام حیدر، ام - اے - - ۶
فنِ تحریر کی ایجاد سے پہلے - - - محمد اسحاق صدیقی - - - ۱۴
مومن کا تغزل - - - - - - - نظیر صدیقی ۲۹
مالہ وما علیہ (جگر کی ایک غزل) - - - - - - - - ۳۷
قدرت کی ایک خاموش مخلوق - - - محمود علی خاں - - - - - ۴۰
"گاہے گاہے بازخواں" (دشمنِ اسلام کون ہے؟) - - - - - ۴۴
منظومات - ساقی، دل - ارشد، نفیس، کیفی، شفقت، مضطر، صفیہ شمیم - ۴۸
مطبوعات موصولہ - - - - - - - - ۵۳

ملاحظات

پاکستان کا نیا دورِ حکومت اور اس کا مستقبل

پاکستان کی جدید وزارتِ عظمیٰ کے ساتھ جو توقعات وابستہ کی گئی تھیں، ان کے متعلق یہ سوچنا کہ وہ کس حد تک پوری ہوئیں قبل از وقت ہے لیکن یہ بالکل یقینی ہے کہ خواجہ صاحب کے آخری عہد میں جو ایک عام کیفیت اضطراب و انتشار کی پاکستان میں پیدا ہو چلی تھی وہ بڑی حد تک کم ہوگئی ہے اور مسٹر محمد علی کے جو بیانات اس وقت تک شایع ہوئے ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے ہوا کا رخ معلوم کر لیا ہے اور یہ بڑی بات ہے۔

پاکستان کے سامنے اس وقت اہم ترین مسئلہ اپنی مالی و اقتصادی دشواریوں کو دور کرنا ہے اور غیر صنعتی، غیر ترقی یافتہ ممالک کے لئے یہ مسئلہ ہمیشہ بڑا دردِ سر ہوا کرتا ہے۔ کیونکہ نہ ملک کی غذائی پیداوار کو دفعتاً اتنا بڑھایا جا سکتا ہے کہ اسے باہر سے غلّہ نہ منگانا پڑے اور نہ وہ اپنے قدرتی صنعتی وسایل کو آناً فاناً کارخانوں اور فیکٹریوں میں تبدیل کر سکتا ہے۔ لامحالہ اسے دوسرے ملکوں کے سرمایہ اور ماہرینِ فن کا منھ دیکھنا پڑتا ہے اور بسا اوقات نہ صرف اپنی ملک کی خام دولت بلکہ اپنی خود داری کو کھو کر یہ سودا کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے کسی ملک کے باشندوں کے لئے فراہمی غذا اور انسداد بے روزگاری کا مطالبہ تو بہت آسان ہے، لیکن جو لوگ ان مطالبات کے پورا کرنے کے ذمہ دار ہیں ان سے پوچھئے کہ یہ مطالبات پورا کرنے کے لئے کتنے ہفتخوان انھیں طے کرنا پڑتے ہیں اور جذبات کا کتنا خون انھیں کرنا پڑتا ہے۔

پاکستان کی پبلک یہ سُنکر غالباً بہت خوش ہوگی کہ امریکہ نے لاکھوں ٹن گیہوں دینا اسے منظور کر لیا ہے، لیکن وہ اس سے بےخبر ہیں کہ

گیہوں کے ایک ایک دانہ کے عوض خود انھیں کیا دینا پڑے گا، روپیہ نہیں، سونا نہیں، بلکہ ترازو کے ایک پلّہ میں غلّہ رکھا جائے گا، دوسرے پلّہ میں آزادی و خودداری اور جب یہ پلّہ جھک جائے گا اس وقت سودا پورا ہوگا۔

اس لئے وہ پاکستان ہو یا ہندوستان جب تک عوام میں یہ احساس نہ پیدا ہو کر دوسروں کی امداد پر جینا، جینا نہیں، موت ہے بلکہ موت سے بدتر کوئی اور چیز، اس وقت تک نہ حکومت کچھ کرسکتی ہے، نہ خدا۔ حکومت تو اس لئے مجبور ہے کہ پبلک کی ذہنیت اس کا ساتھ نہیں دیتی۔ رہا خدا، سو اس کا فیصلہ معلوم ہی ہے کہ وہ کسی قوم کے حال میں کوئی تبدیلی نہیں کرتا جب تک وہ خود اپنے اندر کوئی تبدیلی پیدا نہ کرے (حتیٰ یغیروا ما بانفسہم) یعنی نفس کی تبدیلی، رجحان کی تبدیلی، احساس و وجدان کی تبدیلی! یہی وہ چیز تھی جس نے ہمیشہ قوموں کو اُبھارا اور اسی چیز کا فقدان ہے جو ہمیشہ انھیں مٹاکر رکھدیتا ہے۔

میں ہندوستان کی آبادی کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ اس کے موجودہ رجحانات کیا ہیں، لیکن پاکستان جاکر میں نے وہاں لوگوں کی جس ذہنیت کا مطالعہ کیا وہ یقیناً افسوسناک ہے۔

مسلمانوں نے غالباً یہ سمجھا تھا کہ پاکستان بننے کے بعد وہ کسی ایسی دنیا میں پہونچ جائیں گے جہاں صرف شہد اور دودھ کی نہریں ہوں گی اور فراغ و اطمینان کی کبھی نہ ختم ہونے والی زندگی اور طوبیٰ کے سایہ میں وہ اپنی ساری عمر اینڈ ایڈ کر گزار دیں گے۔

وہ لوگ جو ہندوستان سے ہجرت کرکے وہاں گئے ہیں، کم ازکم ان کے متعلق تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ اسی "فردوسِ ارضی" کا تصور اپنے ساتھ لیکر گئے تھے، اب رہگئے خود پاکستان کے اصلی باشندے سو وہ بھی اس نشہ میں مست تھے کہ حکومت ان کی ہوگی اور حکومت کا مفہوم ان کے نزدیک صرف عیش و تنعم کی زندگی بسر کرنا تھا۔ الغرض تقسیم ہند کے بعد پاکستان کے مہاجرین و انصار دونوں غلط فہمیوں میں مبتلا تھے اور بہت کم نفوس ایسے تھے جو سمجھتے تھے کہ فی الحال پاکستان جغرافی وجود سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا اور اس کو ملک یا حکومت بنانے کے لئے مسلسل جدوجہد کی ضرورت ہے۔

اس میں شک نہیں کہ تقسیم کے بعد پاکستان کی حالت ایک اُجڑے دیار کی سی تھی اور قیام حکومت کیلئے وہاں کے حالات بہت ناموافق تھے لیکن قاید اعظم کا وجود ایک ایسی انرجی (ENERGY) تھی جو ہر جگہ اپنا کام کررہی تھی اور اسی قوت کی بدولت آخرکار یہ مشکل بہ آسانی حل ہوگئی اور حکومت کا ڈھانچہ بہت جلد طیار ہوگیا۔ پھر چونکہ نیا نیا جوش تھا، قایدِ اعظم زندہ تھے، سب کا نقطۂ نظر ایک تھا، اس لئے کم وقت میں بہت کچھ ہوگیا۔

لیکن قایدِ اعظم کی آنکھ بند ہونا تھا کہ ردّ عمل شروع ہوا اور یہ وہی ردّ عمل تھا جس کا قایدِ اعظم کو بھی اندیشہ تھا، یعنی وہاں صوبائی عصبیت شروع ہوگئی اور قومی و ملکی یک جہتی ذاتی و شخصی اغراض کی کشمکش میں پارہ پارہ ہوگئی۔

کیا کوئی کہہ سکتا تھا کہ پاکستان جو غلّہ کا گھر ہے کسی وقت دوسروں کے سامنے دست سوال پھیلانے پر مجبور ہوجائے گا اور وہاں کا TARIFF جس پر اس کی ساکھ قایم تھی دفعتاً یوں غیر متوازن ہوجائے گا۔ لیکن یہ ہوکر رہا اور صرف اس لئے کہ وہاں پاکستان کا کلی وجود ختم ہوگیا اور وہ قوتیں جن کو صرف ایک وحدتِ ملکی کے قیام میں صرف ہونا چاہئے تھا، صوبہ داری تعمیر میں صرف ہونے لگیں حالانکہ اسلام کا مقصد اولین رنگ و نسل کے امتیاز کو بھی مٹانا تھا چہ جائیکہ صوبوں کا امتیاز کہ یہ تو نہایت ادنیٰ درجہ کی چیز ہے۔

الغرض اس وقت پاکستان کو دو بہت بڑے سنگ گراں راستہ سے ہٹانا ہیں یعنی ایک طرف اسے صوبہ داری عصبیت کو محو کرنا ہے اور دوسری طرف معاشی نظام میں ایسی تبدیلی پیدا کرنا کہ وہاں کے عوام یہ سمجھ سکیں کہ آسمان سے من و سلویٰ نازل ہونے کا زمانہ ختم ہوگیا ہے اور اب دُنیا میں وہی قوم زندہ رہ سکتی ہے جو حرکت و عمل سے اپنے آپ کو زندہ رکھنا چاہے۔

مسٹر محمد علی لاکھ باخبر انسان سہی، لیکن ان سے کسی معجزہ کی توقع رکھنا بیکار ہے۔ اگر قوم ان سے حصول اطمینان و فراغ کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس حالت میں کہ وہ خود ان کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ نہیں تو یہ یقیناً معجزہ کا مطالبہ کرنا ہے اور یہ رسم ابتک باقی نہیں

یہ میں نے اس لئے کہا کہ پاکستان کی نئی وزارت عظمیٰ جن گتھیوں کو سلجھانا چاہتی ہے وہ بہت پیچیدہ ہیں اور ہوسکتا ہے کہ ان کے سلجھانے میں بعض ایسی تدابیر سے بھی اسے کام لینا پڑے جو اہل پاکستان کی پچھلی توقعات کے منافی ہوں اور وہ پھر اپنے جذبات سے مغلوب ہوکر مخالفت پر آمادہ ہوجائیں۔

ہم تقسیم ہند کے بعد ہی سے یہ کہتے چلے آرہے ہیں کہ ہندوستان و پاکستان دونوں کی بقا اسی میں ہے کہ دونوں ہر حالت میں متحد رہیں اور آپس کے اختلافات کو دوستانہ طریقہ پر آپس ہی میں طے کریں خواہ کسی کو کتنا ہی کیوں نہ دبنا پڑے۔ اس لئے جب مسٹر محمد علی نے عنان حکومت ہاتھ میں لیتے ہی ہندوستان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تو ہم کو مسٹر محمد علی کی وقت شناسی سے بڑی خوشی ہوئی لیکن اب کہ پچھلے ایک ماہ کے اندر مصالحت و مسالمت کی یہ فضا زیادہ وسیع ہوگئی ہے اور قول سے گزر کر عمل کا وقت قریب تر آتا جا رہا ہے، بعض اوقات یہ اندیشہ بھی دامنگیر ہوجاتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کسی خاص مسئلہ میں پاکستان کے لوگ پھر جذبات سے مغلوب ہوجائیں اور یہ سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔

تمام اختلافی مسایل میں سب سے زیادہ اہم اور بنیادی مسئلہ کشمیر کا ہے اور یہ اسی وقت طے ہوسکتا ہے جب ہندوستان و پاکستان دونوں رواداری سے کام لیں۔ یہ صورت تو اب یقیناً باقی نہیں کہ پورا کشمیر ہندوستان کو مل جائے یا پاکستان کو، اسلئے اب رواداری کا تعلق صرف اس بات سے رہ جاتا ہے کہ وہ اس کی تقسیم پر راضی ہوں، لیکن یہ تقسیم ہندوستان کی سی تقسیم نہ ہو جس نے لاکھوں انسانوں کا خون کرا دیا، بلکہ اس کی نوعیت ایک ایسے سمجھے بوجھے لائحۂ عمل کی سی ہو جس سے آیندہ کے فتنہ و فساد کا بھی سد باب ہوسکے۔

کہا جاتا ہے کہ کشمیر کی تقسیم میں جموں اور لداخ کا علاقہ ہندوستان کو ملنا چاہئے اور آزاد کشمیر کا پاکستان کو۔ خیر اس حد تک تو کسی زیادہ اختلاف کا اندیشہ نہیں ہے لیکن وادی کشمیر کا فیصلہ البتہ بہت مشکل ہے کیونکہ اصولاً اس کو رائے عامہ پر چھوڑ دیا گیا ہے اور پرجا پرشد تحریک نے یہ پہلو ہندوستان کے لئے کافی کمزور کردیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ شیخ عبداللہ کی حکومت نے جو اصلاحات کشمیر میں نافذ کی ہیں وہ وہاں کے عوام کے لئے جن میں غالب حصہ مسلم آبادی کا ہے، بڑی خیر و برکت کا باعث ہیں اور بڑے امید افزا مستقبل کا پتہ دیتی ہیں، لیکن اس کے باوجود ہم سمجھتے ہیں کہ آزاد رائے شماری کے وقت وہاں کا مسلمان ان تمام باتوں کو پس پشت ڈال دے گا اور جموں کی تازہ جن سنگھی شورش کے پیش نظر اس کی ذہنیت ضرور مذہبی جذبات سے مغلوب ہوجائے گی۔ ہوسکتا ہے کہ ان حالات میں رائے شماری کے وقت کشمیر کو دو جداگانہ وحدتوں میں تقسیم کرکے جموں کو ایک علٰحدہ وحدت قرار دیا جائے اور اس صورت میں اس کا قوی امکان ہے کہ جموں کثرت رائے سے ہندوستان کے ساتھ ملحق ہوجائے لیکن اسی کے ساتھ ایک بہت بڑا سوال وہاں کی مسلم آبادی کی ہجرت کا سامنے آئے گا اور کشت و خون سے بچنے کے لئے ہندوستان کو پوری ذمہ داری کے ساتھ انتقال آبادی کا مسئلہ اپنے ہاتھ میں لینا ہوگا، جو آسان بات نہیں ــــ ہم کو نہیں معلوم کہ نہرو اور محمد علی کے درمیان لندن میں جو گفتگو ہوئی ہے اس میں کشمیر کا بھی ذکر تھا یا نہیں اور اگر تھا تو اس کی نوعیت کیا تھی، لیکن مسٹر محمد علی کے تازہ بیان سے پتہ چلتا ہے کہ اس باب میں جو تبادلۂ خیال ہوا ہے وہ کافی امید افزا ہے اور اگر اسی کے ساتھ ہم امریکہ و برطانیہ کے بعض اخباروں کے بیانات کو بھی سامنے رکھیں تو آثار کچھ ایسے نظر آتے ہیں کہ ملکوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے والی مغربی پالیسی کے تحت کشمیر بھی غالباً تقسیم ہوجائے گا، یعنی جموں اور لداخ ہندوستان کو اور آزاد کشمیر کا علاقہ پاکستان کو دیدیا جائے گا۔ اب رہگیا سوال وادی کشمیر کا سو ممکن ہے کہ عبداللہ حکومت کو بدستور قایم رکھتے ہوئے دس بارہ سال کے لئے اسے یو۔ ان۔ او کے سپرد کردیا جائے اور جب اس مدت کے بعد رائے شماری کی جائے تو وہ امریکن پروٹکریٹ کی صورت اختیار کرلے ــــ اگر اس قرارداد پر پاکستان و ہندوستان دونوں راضی ہوگئے جس کا قوی امکان ہے تو اس کا فوری نتیجہ یہ ہوگا کہ دونوں ملکوں کی فوجیں جو وہاں سالہا سال سے بیکار پڑی ہوئی ہیں ہٹ جائیں گی اور دفاعی مصارف کم کرکے وہ اپنے تعمیری منصوبوں کی طرف متوجہ ہوسکیں گے ــــ اس میں شک نہیں کہ یہ فیصلہ ہندوستان و پاکستان دونوں کے اقتدار کو ایک حد تک صدمہ پہونچانے والا ثابت ہوگا ــــ لیکن اگر مفاہمت کی یہ صورت موجودہ دور تذبذب کی الجھنوں اور آیندہ جنگ کے امکانات کو دور کرسکتی ہے تو ہندوستان و پاکستان دونوں کو اسے گوارا کرلینا چاہئے کیونکہ اقتدار کا سوال بڑی حد تک جذباتی چیز ہے اور عملی دنیا کے مصالح تو بڑی بڑی قوموں کو بھی سپر ڈالدینے پر مجبور کردیتے ہیں۔

جوش کی انقلابی شاعری

اُردو شاعری کے نشاطیہ دور کے بعد حالؔی کے اثر سے تنقید حیات شروع ہوئی اور زندگی کو سوارنے نکھارنے کی جدوجہد کا آغاز بھی ہوا، لیکن ہمیں اس کا اثر پہلی جنگِ عظیم سے قبل اتنا نمایاں نہیں ملتا، جتنا اس کے بعد۔ جنگ عظیم کے بعد شاعری وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوئی، شاعری سے پیغام کا کام لیا جانے لگا اور اقبالؔ جیسا عظیم شاعر پیدا ہوا۔ اقبالؔ کے یہاں جو تضاد ملتا ہے اس سے قطع نظر اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو وطنیت قومیت وغیرہ کے محدود تصورات سے آگے وہ ایک ایسے مقام پر نظر آتے ہیں جہاں سے انھوں نے عالمگیر اخوت، مساوات اور محبت کا پیغام دیا۔ اقبالؔ نے اپنی فکر و اجتہاد سے دُنیا کا جو وسیع مطالعہ پیش کیا ہے اُس نے ہماری نئی نسل کو بہت متاثر کیا۔ اقبالؔ زمین کے اندیشوں سے نہ بچ سکے اور وہ سرمایہ دارانہ نظام بھی لوٹ کھسوٹ سے کبھی غافل نہ رہ سکے، مزدوروں کی بدحالی بھی اُن کے پیش نظر رہی۔

اب اُردو شاعری میں نئے عنوانات بھی آئے، نئے خیالات اور تصورات نے بھی جگہ لی لب ولہجہ بھی بدلا۔ قنوطیت کو اپنی جگہ چھوڑنی پڑی اور رجائیت نے اُس کی جگہ لے لی، جبر و استبداد کے آگے سرنگوں ہونے کی بجائے اب مظلوم میدان میں ہتھیار باندھ کر اُتر آیا تھا۔ ہندوستان انگریزوں کی غلامی تلے سسکنا نہیں چاہتا تھا وہ آزاد ہونا چاہتا تھا۔ حالات بدلنے کی امنگ پیدا ہوئی۔ ہمارے شاعروں کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ انگریزوں کی غلامی سے نجات کا مسئلہ تھا۔ اقبالؔ اور جوشؔ کے یہاں یہ سیاسی رجحان دوسرے رجحانات پر غالب ہے۔ مگر اقبالؔ کے یہاں جو گہری مفکرانہ سنجیدگی ملتی ہے جوش کے یہاں وہ مفکرانہ سنجیدگی نہیں ہے۔ جوش کے انقلاب کا تصور محدود اور زیادہ تر رومانی ہے۔

یہاں مقصد جوشؔ اور اقبالؔ کا موازنہ نہیں ہے بلکہ جوشؔ کی انقلابی شاعری کو پرکھنا ہے۔ عام طور پر جوشؔ کو "شاعرِ انقلاب" کہا جاتا ہے۔ اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے کہ جوشؔ کی انقلابی شاعری بڑی حد تک مکمل ہے اور اُن کی شاعری کا بیشتر کامیاب حصہ انقلاب ہی سے متعلق ہے، اگر تعمیری مقصد کے بغیر تخریب کا نام انقلاب ہے تو جوشؔ واقعی انقلابی شاعر ہیں اور اگر خطابت کا نام شاعری ہے تو کسی کو جوشؔ کی شاعری میں شبہ نہیں ہونا چاہیے، لیکن ہم جانتے ہیں کہ نہ تو محض تخریب کا نام انقلاب ہے اور نہ خطابت کا نام شاعری۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اُردو میں جوشؔ ہی پہلے شاعر ہیں جنھوں نے مذہب، سماج، محکومی اور خدا کے خلاف نعرۂ بغاوت بلند کیا ہے۔ لیکن ہمیں جوشؔ کو نعرہ لگانے والے کی حیثیت سے نہیں دیکھنا ہے بلکہ شاعر کی حیثیت سے پرکھنا ہے۔ جوشؔ کی نظموں میں بہت زیادہ بلند آہنگی ہے۔ مگر اس قدر بلند آہنگی ہونے کے باوجود اُن میں واقعیت نظر نہیں آتی۔ ستائے ہوئے، گرے ہوئے، بدحال عوام کے حالِ زار پر رونے کے لئے آنسو نہیں ہیں، محبت بھرے الفاظ بھی نہیں، اگر اُن کے پاس کچھ ہے تو صرف اُن کے آتشیں الفاظ ـــ! اُن کے انفرادی جذبات زورِ بیان کی

تمام شگفتگی و لطافتوں کو جھلساتے چلے جاتے ہیں ؎

گرم ہے سوزِ بغاوت سے جوانوں کا دماغ ـــــ آندھیاں آنے کو ہیں اے بادشاہی کے چراغ

یا :- کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب ـــــ میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

اور :- آہ اے ہندوستاں اے مفلسوں کی سرزمیں ـــــ اب تو ایک روٹی کا ٹکڑا بھی تجھے ملتا نہیں

یہ آتش فشاں خطبہ ہو تو ہو مگر شاعری نہیں ہے۔

جوش اور جوش کے سامعین کے درمیان بڑی اجنبیت محسوس ہوتی ہے، کوئی رشتہ نہیں۔ کوئی تار نہیں جو ان دونوں کو ملا سکے، دونوں کے درمیان ایک خلیج ہے جس کو پاٹنے کے لئے جوش کے پاس کچھ نہیں ہے، جوش ایک آگ سچانکنے والا باغی ہے جو کسی بہت ہی اونچی چٹان پر کھڑا ہو کر آگ اور خون کی بارش کر رہا ہے، ہر لفظ ایک انگارہ ہے، ایک شعلہ! جوش ایک آتش فشاں کی طرح آگ اُگلتے چلے جاتے ہیں اور عام سطح کا انسان مرعوب ہو کر محض تماشائی بن کر دیکھتا رہ جاتا ہے وہ اُن سے مرعوب ہوتا ہے مگر متاثر نہیں ہو سکتا۔ جوش کے سامعین جوش کی آواز کو اپنی آواز نہیں سمجھ سکتے، جس سے وہ شاعر کی آواز کو اپنے دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ پائیں اپنے پن کا وہ رشتہ جو شاعر اور سامعین کے درمیان ہونا چاہئے، غائب ہے۔

فنکار اپنے فن سے اُس وقت تک عوام کو متاثر نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ اپنے تصورات کو موزوں جامہ نہ عطا کرے شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ یقیناً بہت اہم ہے مگر یہ کم اہم نہیں ہے کہ وہ اپنی بات کس طرح کہتا ہے۔ جھنجھلاہٹ اور غصہ نے مل ملا کر جوش کی شاعری کو خطیبانہ رنگ میں اس حد تک غرق کر دیا ہے کہ شعریت مردہ ہو گئی ہے، وہ بیان و اندازِ بیان انقلاب و شعر میں خوشگوار توازن قایم نہیں کر سکے۔ وہ واعظ ہیں، باغی ہیں، مگر شاعر نہیں!

جوش کے اس خطیبانہ اندازِ بیان کے علاوہ جو چیز ان کے موضوع کی سطحیت کی ذمہ دار ہے وہ ان کی سماجی علوم سے ناواقفیت ہے۔ جوش کی انقلابیت کو کسی سماجی عالم کا سہارا نصیب نہیں ہے۔ جوش کے یہاں موجودہ سماج سے بغاوت، مذہب سے انحراف اور حکومت سے نفرت کی کوئی ٹھوس اور اثباتی بنیاد نہیں ہے، جوش کی بغاوت ایک جذباتی چیز ہے ان کی بغاوت میں جتنا دخل ان کے جذبات کو ہے اتنا عقل کو نہیں۔ یہ جذباتیت موضوع میں کوئی گہرائی پیدا نہیں ہونے دیتی اس لئے جوش شوکتِ الفاظ میں پناہ لیتے ہیں جن سے ظاہری طور پر تو بڑا دبدبہ اور وقار ظاہر ہوتا ہے مگر ان کا اثر جلد زایل ہو جاتا ہے۔

وہ سرمایہ دار کو پرشکوہ الفاظ میں گالیاں اور کوسنے دے سکتے ہیں مگر اس کی کوئی وجہ بیان نہیں کر سکتے وہ حُسن کو کنکر کوٹنے پر مجبور دیکھ کر ایک خالص جذباتی نظم کہہ سکتے ہیں مگر اس کا تجزیہ نہیں کر سکتے۔ اس نظام کی طرف اشارہ بھی نہیں کر سکتے جو اس کا ذمہ دار ہے ـــــ وہ اس کا کنکر کوٹنا گوارا نہیں کر سکتے محض اس لئے کہ وہ حسین ہے اور جوان لیکن چھوٹا ناگپور کی سیاہ فام جھریاں پڑی بڑھیا کو مٹی ڈھوتے ہوئے دیکھ کر ان میں کوئی تحریک پیدا نہیں ہوتی۔ جوش کے انقلاب کا تصور دراصل رومانی ہے اور اس میں مفکرانہ گہرائی اور سنجیدگی نہیں ہے جو انقلابی شاعری کے لئے ضروری ہے

میں نے ابھی ظاہر کیا ہے کہ جوش کی شاعری میں خطیبانہ جلال ہو تو ہو، مگر شاعرانہ جمال نہیں ہے اس سے میرا مقصد یہ نہیں کہ میں جلال و جمال کے درمیان ایک دیوار حایل کرنا چاہتا ہوں اور ان دونوں کو ایک دوسرے سے متعلق نہیں سمجھتا۔ بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ وہ جلال جو چنگیز کی آنکھوں سے شعلہ فشاں ہوتا ہے اور وہ جلال جو ایک شاعر کی آنکھوں سے محبت کے پھول برساتا ہے۔ دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ جوش کے یہاں معنوی جلال کا پتہ نہیں چلتا، جو کچھ شان و شکوہ اور جلال ہے وہ الفاظ تک ہی محدود ہے، ان کی نظم "کارل مارکس" کے چند اشعار دیکھئے ؎

نخلِ خوشحالی کی بیخ و بن ہے تو ــــــ عقدہ ہائے زیست کا ناخن ہے تو
اے خطیبِ منبرِ فیضِ عمیم ، ــــــ اے ضیائے مشعلِ رزقِ کریم !
ہمدمِ شبیرؔ و بدخواہِ "یزید" ــــــ موسئی نو بہر فرعونِ جدید !

اس میں کارل مارکس سے کسی دلی محبت کا پتہ نہیں چلتا، اُس نے دنیا کو کیا دیا یہ بھی معلوم نہیں ہوتا - کوئی پیغمبر تھا، مصلح تھا ؟ یہ بھی نہیں معلوم ! ایک مصنوعی اور پرتکلف قسم کا اظہارِ عقیدت ہے اور بس ! کارل مارکس کو دانائے راز - مریضِ انسانیت کا چارہ ساز، عقدہ ہائے زیست کا ناخن، خطیبِ منبرِ فیضِ عمیم ، اور ضیائے مشعلِ رزقِ کریم کے خطابات دیکر جوشؔ نے سمجھ لیا کہ انھوں نے انقلابی شاعری کا حق ادا کر دیا - الفاظ کے جلال کے نیچے محض ایک کھوکھلا دماغ ہے - جس میں کوئی روح نہیں، کوئی زندگی نہیں، کوئی حرکت نہیں -

جوشؔ کے نعرۂ انقلاب کو شعور کی رہبری حاصل نہیں ہے - اس میں شبہ نہیں کہ اس سلسلے میں جوشؔ کا اتنا قصور نہیں جتنا شعور کی اس کمی کا ہے جس کی بنا پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ انقلاب اور موسیقی کا کوئی تعلق نہیں ہے -

یا رقص کی محفل میں بجا تال سے گھنگھرو ــــــ یا جنگ کے میداں میں سنا تیغ کی جھنکار

پڑھنے والے سوچتے ہیں تیغ کی جھنکار اور گھنگھرو کی چھنا چھن میں آخر کیا بُعد ہے ؟ ؟ شاعر دونوں میں سے کسی ایک کے انتخاب پر کیوں زور دے رہا ہے ؟ کیا گھنگھرو کی تال پر انقلابی ترانے نہیں گائے جاسکتے ؟ یا رقص کی محفل یا جنگ کا میدان کیوں ؟ یا گھنگھرو یا تلوار کیوں ؟ اگر غور کیا جائے تو اس "یا" کے پیچھے فکر کا اوتھلاپن نظر آئے گا شعور کی سطحیت دکھائی دے گی - یہ فکر کا چھچھلاپن اور شعور کی سطحیت کیوں ہے ؟

شعور کی پختگی اور فکر کی گہرائی مطالعہ کی وسعت سے پیدا ہوتی ہے اور جوشؔ اس نعمت سے محروم ہیں، جو شاعر جذباتی طور پر انقلابی ہو جاتے ہیں ان کے یہاں فکر کا اوتھلاپن کوئی تعجب کی بات نہیں - سماجی علوم سے ناواقفیت حالات کا تجزیہ کرنے سے روک دیتی ہے - مطالعہ سے میری مراد کتابی مطالعہ اور زندگی کا مطالعہ دونوں ہیں - جوشؔ کے یہاں زندگی کو نزدیک سے دیکھنے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ہے - اور نہ کوئی ایسی تڑپ ملتی ہے جس کا سرچشمہ زندگی ہو - انھوں نے ہندوستان کی تمام سیاسی تحریکات کو ایک تماشائی کی حیثیت سے دیکھا ہے، ظاہری حالات کو دیکھ کر روح تک پہونچنا ناممکن ہے - یہی وجہ ہے کہ جوشؔ کی سیاسی نظمیں ناکامیاب ہیں - انھوں نے ان تحریکات کا اثر محض جذباتی طور پر قبول کیا ہے تحریکات سے - یہ دوری ہی جوشؔ کو تحریکات کی بنیاد سمجھنے نہیں دیتے اور وہ سماجی اور سیاسی مسایل کا تجزیہ کرنے سے معذور ہو جاتے ہیں اور اُن کا کوئی حل پیش نہیں کر سکتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بھی شوکتِ لفظی کی نقاب ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں - ڈاکٹر اعجاز حسین لکھتے ہیں :-

"اقبالؔ نے اپنا مفہوم ادا کرنے کے لئے اصطلاحی الفاظ اور مخصوص محاورے منتخب کر لئے تھے جو فلسفیانہ نکات کے بیان کرنے میں ایک خاص سماں پیدا کر دیتے ہیں جس میں پوری فضا حکیمانہ انداز سے سامنے آجاتی ہے - جوشؔ کے اپنے بیانات کو پیش کرتے وقت اس قسم کا کوئی ماحول پیدا نہیں کیا"

جوشؔ اس قسم کا کوئی ماحول پیدا نہیں کر سکتے اس لئے کہ ان کے موضوع میں وہ گہرائی نہیں ہے جس سے وہ پرشکوہ اندازِ بیان کو نباہ سکتے اگر موضوع میں گہرائی نہ ہو، فکر میں رچاؤ نہ ہو یا موضوع میں گہرائی کم ہو اور فکر میں کم رچاؤ ہو تو حسین سے حسین الفاظ اس میں جان پیدا نہیں کر سکتے - شاندار الفاظ انھیں عظمت نہیں بخش سکتے، رنگ و روغن محض بناؤ سنگار سے نہیں آتا بلکہ رگوں میں جوان خون بھی ہونا چاہئے - زرق برق پوشاک ہی سے حسن نہیں نکھرتا بلکہ جسم کو

جامہ زیب بھی ہونا چاہئے۔

جوش کی چند سیاسی نظموں کو لیجئے اور ان کا تجزیہ کر کے دیکھئے کہ جوش کا سیاسی شعور کیا ہے۔ (۱) وقت کی آواز۔ (۲) کانگریس سے خطاب (۳) لیگ سے خطاب۔ (۴) کمیونسٹ سے خطاب۔

مادر ہندوستان کہتی ہے:۔

میرے تو بس ہیں تین چمکتے ہوئے نگیں — اک کانگرس کہ ہے وہ بلوٹھی کی نازنیں
اور لیگ اس کی پیٹ کی بچی قمر جبیں، — اور کمیونسٹ ہے مرا فرزند نکتہ چیں

یہ ہے مادرِ ہند کا تجزیہ۔ اس میں تفکر کی سنجیدگی کا دور دور پتہ نہیں ہے۔ ان نظموں میں بھی وہی سطحیت نمایاں ہے جو محدود مطالعہ اور ناپختہ شعور کی پیداوار ہے۔ اب مادرِ ہندوستان کی زبان سے سنئے جوش کیا کہلواتے ہیں ؎

آؤ سنو بھی مادرِ ہندوستاں کی بات — بیٹا وہی شریف ہے مانے جو ماں کی بات
وہ کہہ رہی ہے دل میں کدورت نہ چاہئے — اچھے تو کیا بروں سے بھی نفرت نہ چاہئے

کانگریس، لیگ اور کمیونسٹ پارٹی کے سیاسی اختلافات اور نظری تفاوت کو جوش نے بھائی بہنوں کی رومانی کھٹ پٹ سمجھا ہے اور وہ نہیں جانتے کہ کانگریس کی باگ ڈور کن ہاتھوں میں ہے ان کی طبقاتی بنیاد کیا ہے۔ وہ لیگ کی زہریلی سیاست اور فرقہ وارانہ طریق کار کو کوئی تجزیہ نہیں کر سکتے وہ کمیونسٹ پارٹی کو اپنی سیاسی سمجھداری کی بنا پر ایک نابالغ بچہ تصور کرتے ہیں جو بڑا ذہین ہے۔

اور ــــ "اچھے تو کیا بروں سے بھی نفرت نہ چاہئے" جوش نفرت و محبت کے فلسفہ سے بھی بیگانہ ہیں وہ نہیں جانتے کہ اگر نفرت شدید نہ ہو تو محبت کی بنیاد ٹھوس نہیں ہو سکتی۔ اگر ہم ایٹم بم سے شدید ترین نفرت نہ کریں تو ہمیں امن و شانتی سے دلی محبت نہیں ہو سکی، جب ہم بری چیز سے نفرت کرتے ہیں تو یہی نفرت اچھی چیز سے محبت کی بنیاد بنجاتی ہے۔ یہاں پر جوش گاندھی جی سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ مجھے تو ہمیشہ جوش سے یہی ڈر معلوم ہوتا رہتا ہے کہ پتہ نہیں کب کس چیز سے متاثر ہو جائیں گے، ایک طرف تو وہ نیٹشے سے اتنے متاثر ہوئے کہ اپنی شاعری کا ایک حصہ اس کے نام معنون کر دیا اور دوسری طرف گاندھی جی سے متاثر ہیں اور پھر باغی اور انقلابی ہیں۔

مذہب کی بنیاد پر ہندوستان میں دو قومی نظریہ کو سہارا دینے کے لئے جوش نے جن غیر حقیقی دلایل کو پیش کیا ہے وہی لیگی رہنماؤں کے تھے ان کے خیال میں اس کی بنیاد مذہب ہے حالانکہ قوم ایک ایسی ملت ہے جو تاریخ کے ارتقاء سے پیدا ہوتی ہے اور جس کی زبان جس کا وطن اور جس کی اقتصادی زندگی ایک ہوتی ہے اور جو ایک مخصوص نفسیاتی ساخت رکھتی ہے اور اس کا اظہار اس کے مشترک کلچر سے ہوتا ہے جوش کی زبان سے ہندوستانی مسلمان اور ہندو کا فرق ملاحظہ ہو ؎

قصوں میں اختلاف، فسانوں میں اختلاف — لہجوں میں اختلاف زبانوں میں اختلاف
وضع و طریق، حرف و حکایت شگون و فال — اندازِ نطق، طرزِ عمل جادۂ خیال،
رسم و رواج، دین و روایات قیل و قال، — اٹھک بیٹھک، بات چیت، لب و لہجہ چال ڈھال
تم میں ہر ایک چیز جدا، ہر چلن جدا — دونوں کے پھول پات جدا ہیں چمن جدا

اگر یہاں جوش سے یہ سوال کیا جائے کہ بنگال کے مسلمانوں اور ہندوؤں کی زبان میں کیا فرق ہے، اور پنجاب کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں کیا فرق ہے؟ تو جوش کوئی فرق نہیں بتا سکتے! جوش فرقہ واریت کے سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح کیوں بہہ گئے۔ کیونکہ ان کی سمجھداری کی کوئی ٹھوس اور اثباتی بنیاد نہیں تھی۔ انھوں نے کبھی حالات کا کسی اصول کے تحت

تجزیہ نہیں کیا انھیں نعرے پسند ہیں اس لئے نعرے لگاتے بھی ہیں۔ اور نعروں کا ساتھ بھی دیتے ہیں اس کے پیچھے کوئی ٹھوس شعور نہیں ہوتا۔

اب اگر اوپر کے اشعار میں اندازِ بیان پر غور کیجئے تو پتہ چلتا ہے کہ جوش نے ان اشعار میں بھی عادت کے مطابق الفاظ کا ایک میلہ لگا دیا ہے، جہاں خیال ایک بچّے کی طرح کھو گیا ہے۔ اور جس طرح میلہ میں دوکانوں کی کوئی خاص ترتیب، تنظیم اور قرینہ نہیں ہوتا بالکل اسی طرح یہاں بھی الفاظ کی ترتیب، تنظیم اور قرینہ پر دھیان نہیں دیا گیا ہے۔ پہلے مصرعوں کے دونوں حصّوں میں کون سی الگ بات کہی گئی ہے۔ "لہجہ، زبان، اندازِ نطق، بات چیت، لب و لہجہ" ان الفاظ کو بار بار دہرایا گیا ہے۔ جن سے ایک ہی معنی نکلتا ہے۔ الفاظ کے کثرتِ استعمال سے کلام میں تکرار اور اعادہ کا نقص پیدا ہوگیا ہے۔

خیر۔ اب نفسِ مضمون کی طرف آیئے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے فرق کو بیان کرنے کے بعد کانگریس کے سامنے حرفِ مدعا زبان پر لاتے ہیں ؎

چھوٹی بہن مرادنہ جب تک کہ پائے گی بیٹیا یہ روز روز کی کل کل نہ جائے گی

یعنی مطالبۂ پاکستان کو مان لینا چاہئے۔ دیکھا آپ نے سیاسی تحریکات کو اوپر ہی اوپر سے دیکھنے کا نتیجہ؟ مطالعہ کے فقدان اور شعور کی ناپختگی کا عطیہ؟

"کانگریس سے خطاب" اور "لیگ سے خطاب" میں جوش کے شعور کی بے بسی اور بے کسی کا جو مظاہرہ ہوتا ہے وہ "کمیونسٹ سے خطاب" میں مکمل ہو جاتا ہے۔ پہلا ہی شعر ہے ؎

اور تو اداس اداس ہے کیوں کمیونسٹ لال صورت دھواں دھواں ہے تو اُلجھے ہوئے ہیں بال

بہت سے اوچھے مخالفین تحقیر کے خیال سے کمیونسٹ کی تصویر کشی کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ یہ بڑے بڑے اور اُلجھے ہوئے بال رکھتے ہیں۔ داڑھی بڑھی ہوئی اور ان کے چہرے پر ہوائیاں اُڑتی رہتی ہیں۔ اس گمراہ کن اور غلط خیال سے جوش اس قدر متاثر ہیں کہ انھوں نے اس پر صاد کر دیا، اس میں جوش کی بدنیتی کو دخل نہیں ہے بلکہ انھوں نے اپنی معصومیت سے ایسا کیا ہے کاش جوش نے کسی کمیونسٹ کو نزدیک سے دیکھا ہوتا اور عمل اور جدوجہد کی سرخیوں سے تابناک چہرے پر امید اور یقین کی جھلکیاں دیکھی ہوتیں۔ آگے چل کر انھوں نے کمیونسٹ لال کو اپنی بڑی بہنوں کانگریس اور لیگ کے آگے جھکنے کی مادرانہ تلقین کی ہے ؎

جھکتے ہیں مان سمجھ کے اکڑتے نہیں ہیں بھائی بہنوں کی جھڑکیوں پہ بگڑتے نہیں ہیں بھائی

اس نظم میں جوش کی انقلابیت نے اصلاح پسندی کا روپ دھار لیا ہے۔ پوری نظم میں جو روح کارفرما ہے اس پر اصلاح پسندی کی بڑی گہری چھاپ ہے۔ پچھلی تین نظموں میں سمجھوتہ بازی کا جو پرچار کیا ہے وہ اس نظم میں آکر اور بھی پختہ ہو گیا ہے۔ اصلاح پسندی کا یہ رجحان اس بات کا غماز ہے کہ سماج کے طبقاتی نظم کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ کمیونسٹ پارٹی کی آئیڈیلوجی اور کانگریس کے عناصر کو سمجھے بغیر ان کے اغراض و مقاصد کو سمجھنا محال ہے۔ آگے جوش کی تمنائیں ملاحظہ ہوں:-

میری دعائیں جب تجھے دولھا بنائیں گی برسے گا نور ڈومنیاں گیت گائیں گی،
بچّوں کے غل میں سالیاں جوتے چرائیں گی بہنیں بھی نیگ مانگنے اس وقت آئیں گی
سمجھوں گی مجھ پہ حق کا یہ احساں بڑا ہوا دیکھوں گی تجھ پہ ان کا جب آنچل پڑا ہوا

کمیونسٹ لال کے سر پر کانگریس دیدی اور آپا لیگ کے آنچل کا تماشہ بس جوش کی ایجاد ہے۔

کمیونسٹوں پر مخالف کیمپ سے ایک الزام یہ قایم کیا جاتا ہے کہ کمیونسٹ پارٹی کی پالیسی ماسکو سے بن کر آتی ہے اور یہ کہ ان میں نیشنلزم نہیں ہوتی وہ الزام جوش نے براہ راست تو نہیں دیا مگر اس کا اثر ضرور قبول کیا ہے اور نتیجہ کے طور پر پند و نصائح کا ایک دفتر کھول دیا ہے:۔

پردیسیوں کی بوتلوں میں ڈاٹ ہو تیری — کپڑا تو روس کا ہو مگر کاٹ ہو تیری

جوش نے کمیونسٹوں کی پرخلوص حب الوطنی اور کانگریس کی نیشنلزم کے فرق کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی ہے۔

ایک اور غلط بات جسے شروع میں پھیلانے کی کوشش کی گئی یہ ہے کہ کمیونسٹ تمام قدیم چیزوں کو قابلِ اعتناء نہیں تصور کرتے گویا انھیں ماضی سے کوئی سروکار ہی نہیں، یہ بات جوش کے دل میں کھٹکتی ہے حالانکہ اگر غور کیا جائے تو یہ بات بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ در اصل ماضی ہی کی زندگی کے تجربات پر تو مستقبل کی بنیاد رکھی جاتی ہے اور ان سے بڑھکر اور کوئی ماضی کی روایات کا سچا قدر داں نہیں۔ قدیم روایات کی پوجا کرنا اور بات ہے اور ان کو لیکر آگے بڑھنا اور بات ہے۔ جوش کا خدشہ ملاحظہ ہو:۔

اس کا مگر خیال رہے وقتِ سرخوشی، — خم میں نئی شراب ہو ساغر رہیں یہی،
میری ہی کنگھیوں سے بنے زلفِ زندگی — میرے ہی جملہ ساز ہوں میری ہی راگنی
تازہ ہوں اصطلاحیں مقولے یہی رہیں — شاخیں نئی ضرور ہوں جھولے یہی رہیں
کل کی جبیں پہ نقش ہو اک گوٹ آج کا، — دستور نو میں رنگ ہو میرے مزاج کا

ان نظموں میں بھی وہی مصنوعی وقار پایا جاتا ہے جو سامعین اور جوش کے درمیان ہمیشہ حایل رہتا ہے۔

جوش کی نیچرل شاعری کو دیکھا جائے تو وہاں بھی جوش کی جذباتیت اس حد تک مسلط ہے کہ مناظر قدرت کی عکاسی مکمل اور موثر طور پر نہیں ہو پاتی، الفاظ کا ایک دریا ہے جو تمام حسن و جمال کو بہاتا ہوا بڑی تیزی کے ساتھ نظروں کے سامنے سے گزر جاتا ہے اور دیکھنے والا حیران اور مبہوت رہ جاتا ہے۔ جذباتی شاعری کا درجہ قدرتاً پست ہوتا ہے کیونکہ اس میں گہرائی اور سنجیدگی پیدا ہونا ممکن نہیں۔

نئی تشبیہات سے شاعری میں ایک کیف ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔ خوشگوار اور نکھری ہوئی تشبیہات تو نظم کو دلفریبی عطا کرتی ہے، لیکن جوش کے پاس الفاظ اور تشبیہات کا جو خزانہ ہے وہ یہاں بھی انھیں کامیاب نہیں ہونے دیتا۔ زیادتی ہر چیز کی بُری ہوتی ہے یہی حال جوش کی تشبیہات کا ہوتا ہے ایک کے بعد دوسری اور پھر تیسری اس طرح تشبیہات کا ایک بے ترتیب ریلا آتا جاتا ہے اور ایک سے دوسرے کا اثر زایل ہوتا جاتا ہے۔ جوش نے گرچہ مذہب کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا ہے مگر یہاں بھی ان کا شعور کارفرما نہیں ہے بلکہ انھوں نے محض جذباتی طور پر خدا اور مذہب کے خلاف لکھا ہے۔

جس طرح مذہب نے انسان کو برابر اس کی موت سے ڈرایا ہے اور یہ بتایا ہے کہ دُنیا فانی ہے۔ انسان کی زندگی بہت مختصر ہے، اس پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے۔ اس دنیا میں رہ کر عیش آرام کی بات سوچنا غلط ہے اور گمراہی ہے۔ اصلی فکر آخرت کی ہونی چاہئے۔ اس لئے دنیا کے آرام کا خیال عبث ہے۔ آخرت کو سنوارنے کی لگن ہونی چاہئے۔ اس طرح جوش نے بھی بتایا ہے کہ یہ زندگی کچھ بھی نہیں، کمال زندگی بس موت ہے۔ اس طور پر شکست کا احساس پیدا ہوتا ہے، بددلی پھیلتی ہے اور انسان کی قوت عمل مفلوج ہو جاتی ہے نظم جنازہ میں:۔

دیکھ اے انساں یہ کیا شے جا رہی ہے دوش پر ہاں خدارا اک نظر اس پیکرِ خاموش پر
کون یہ اوڑھے کفن تا حشر سونے کے لئے جا رہا ہے قبر کی خوراک ہونے کے لئے

اس سے پہلے یہ "پیکرِ خاموش" کیا تھا ؎

اس کی راتیں بھی تبسم کی طرح شاداب تھیں اس کے دل میں بھی بہت سی حسرتیں بیتاب تھیں
موت کے آتے ہی چہرہ زرد ہو کر رہ گیا ایک جھونکے میں یہ شعلہ سرد ہو کر رہ گیا

اور پھر سے نتیجہ — ؟

اب تو افشا ہو گیا رازِ کمالِ زندگی او غلامِ زندگی دیکھا مآلِ زندگی

چنانچہ اسی کے پیشِ نظر جوش نے راہ فرار اختیار کی ہے ؎

بجلیاں جس نخل پر رقصاں ہوں پھل سکتا نہیں تیری اس دنیا کا مجھ سے کام چل سکتا نہیں
میں پروں کو تولتا ہوں آشیانے کو سنبھال یہ ہے دنیا اور اپنے کارخانے کو سنبھال

جس طرح مذہب نے دنیا کے عیش و آرام سے متنفر کر کے عوام کی قوتِ عمل کو شل کر دیا اور ایک طبقہ نے اپنے مفاد کے لئے مذہب کی تعلیمات کو عام کر کے فائدہ اٹھایا اسی طرح جوش بھی انسان کے سامنے موت کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ چند روزہ زندگی سے ان کو نفرت ہو جاتی ہے اور شاندار آغاز کا بھیانک انجام دیکھ کر دنیا کو سنوارنے کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے یہ سب محض اس بات کا نتیجہ ہے کہ جوش نے کبھی مذہب کے متعلق سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت کو محسوس نہیں کیا اور انھوں نے محض جذبات کے بہاؤ میں مذہب اور خدا کی مخالفت کی مذہب کا صحیح تجزیہ ان کے یہاں نہیں ملتا ہے مذہب کے تاریخی کردار کو انھوں نے کبھی اجاگر نہیں کیا۔ اس کو کس طرح لوٹ کھسوٹ کرنے والے طبقے نے اپنے مفاد کے لئے استعمال کیا اور کر رہا ہے۔ ان ساری باتوں کا جوش کے یہاں پتہ نہیں ملتا اور یہیں سے ان کی شاعری نعرہ بازی کے سرحدوں سے جا ملتی ہے جس میں تفکر کی گہرائی اور شعور کی سنجیدگی کا فقدان ایک قدرتی امر ہے۔

دوسرے مسایل کے سلسلے میں بھی جوش کا زاویۂ نگاہ بہت ہی کھوکھلا اور غیر حقیقی ہے۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ جوش سماج سے نابلد ہیں انھیں سرمایہ دارانہ نظام کی خصوصیات کے بارے میں کچھ علم نہیں انھوں نے ہر مسئلہ کی سطح کو دیکھا اور کبھی اس کی گہرائی میں نہیں اُترتے ہیں۔ مثال کے طور پر عورتوں کے مسئلہ پر جوش کی رائے ملاحظہ ہو۔ وہ مغربی عورتوں کو بے حیا تصور کرتے ہیں اور مشرقی عورتوں کو نہایت ہی پاکباز مقدس دیوی ؎

جب کرے گی صنفِ نازک اپنی عریانی پہ ناز صرف اک تو اُس تلاطم میں رہے گی پاکباز

تعلیم نسواں کے متعلق ان کے خیالات ملاحظہ ہوں۔ مشرقی عورت کو جہالت پر قانع رہنے کی تلقین کرتے ہوئے جوش اور مسجد کے ملا میں کیا فرق رہ جاتا ہے ؎

علم سے ہر چند تجھ کو کم کیا ہے بہرہ مند لیکن اس سے ہو نہ اے معصوم عورت! دردمند
جب ضرورت سے زیادہ ناز فرماتا ہے علم عارضِ تاباں کے بھولے پن کو کھا جاتا ہے علم
علم سے بڑھتی ہے عقل اور عقل سے وہ بد دماغ جو بجھا دیتی ہے سینے میں محبت کا چراغ
چاندنی، قوس قزح، عورت، شگوفہ، لالہ زار علم کا ان نرم شانوں پر کوئی رکھتا ہے بار

عورت کی تعلیم کو جوش اس کے نرم و نازک شانوں پر ایک بار تصور کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ علم کی وجہ سے اس کے سینہ میں "محبت کا چراغ" گل ہو جائے گا۔ عقل کے بڑھنے کو بھی جوش گوارا نہیں کرتے وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ نزاکت عورت کا ایک پہلو ہے۔

خاتونِ مغرب کے متعلق جوش کے خیالات اور رجعت پسند مولوی کے خیالات میں کوئی فرق نہیں ہے۔ انھوں نے مغربی عورت کی بے باکی اور بے حیائی کا سبب سماج کے نظام میں تلاش کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی اخلاقی گراوٹ کو اگر جوش دوسرے سماجی مسایل سے الگ تھلگ مسئلہ تصور کرتے ہیں تو یہ محض کوتاہ بینی ہے۔ یہ ساری خرابیاں جو مشرق و مغرب کے سرمایہ دارانہ ممالک میں مشترک ہیں ——— اُسی سماج کی ہیں جس میں اخلاق محض منافع کا نام ہے اور ہر بات کی تان منافع پر ٹوٹتی ہے۔ مغربی عورت کے متعلق جوش کی رائے کی تان یہاں ٹوٹتی ہے ؎

نازکی، عزت، محبت، آبرو کچھ بھی نہیں   نام تو ہے پھول لیکن رنگ و بو کچھ بھی نہیں

جوش کی پوری انقلابی شاعری میں فکر کی سطحیت نمایاں ہے۔ اُنھوں نے جس مسئلہ پر قلم اُٹھایا ہے اسے نزدیک سے دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ مطالعہ کے فقدان اور سیاسی و سماجی تحریکات سے دوری۔ یہی چیزیں ہیں جنھوں نے جوش کو موضوع کی گہرائیوں میں اُترنے نہیں دیا ہے۔ الغرض جوش شاعر کم ہیں، خطیب زیادہ، مفکر کم ہیں اور جذباتی زیادہ!

کلام حیدری ام۔ اے

(نگار) دیکھا جاتا ہے کہ آجکل بعض نقاد جب کسی شاعر کے کلام پر اظہار خیال کرتے ہیں تو تقابلی مطالعہ کے لئے کسی اور شاعر کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ کسی چیز کے پرکھنے اور نقد و نسیہ کی تمیز کے لئے یہ طریقِ عمل غلط نہیں ہے لیکن اس سلسلہ میں اس حقیقت کو اکثر و بیشتر نظر انداز کر دیا جاتا ہے، کہ ہم جن دو شاعروں کا کلام پہلو بہ پہلو رکھ کر ایک کی فوقیت دوسرے پر ظاہر کرنا چاہتے ہیں، وہ دونوں ایک ہی منزل کے مسافر ہیں، یا ان کی راہیں الگ الگ ہیں ——— مومن کے ساتھ غالب کا اور میر کے ساتھ درد کا ذکر کیوں کیا جائے۔ جب داغ پر بات چلے تو امیر کو کیوں سامنے لایا جائے، لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے اور غلط ہوتا ہے۔

یہی غلطی اس مضمون میں بھی کی گئی ہے کہ جوش کے ساتھ اقبال کو بھی لے لیا گیا ہے، اگرچہ یہ غلطی اس سے قبل بعض نقادوں کی طرف سے ہو چکی ہے تو یہ اس کے جواز کی دلیل نہیں ——— اقبال اور جوش دونوں کی راہیں بالکل جدا ہیں، تخئیل، معنویت، احساس، تاثر، غرض ہر لحاظ سے جدا۔ دونوں کا زاویۂ نگاہ ایک دوسرے سے مختلف ہے اور دونوں کی زبان ایک دوسرے سے الگ۔

اس میں شک نہیں سیاست و مذہب کے متعلق دونوں نے نظمیں لکھی ہیں۔ لیکن موضوع کا اتحاد اس کو مستلزم نہیں کہ دو شاعروں کے کلام کو سامنے رکھ کر ان میں ایک پر دوسرے کو ترجیح دیجائے، خاص کر ایسی صورت میں جبکہ دونوں کا مقصود ایک دوسرے سے جدا ہو۔ ایک کے یہاں مذہب کی رندانہ تضحیک ہے۔ دوسرے کے یہاں حکیمانہ رشد و ہدایت، ایک کے یہاں سیاست وقتی و جذباتی کھیل ہے اور دوسرے کے یہاں ملت و قوم کی بنیاد، ایک کے یہاں زبان معنی کی پابند ہے، دوسرے کے یہاں معنی زبان کا پابند۔ ایک کا مقصود دنیا سے صرف کھیلتے ہوئے گزر جانا ہے، دوسرے کے یہاں دُنیا کے لئے سر دُھننا۔ پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جوش و اقبال کا ذکر کیوں ساتھ ساتھ کیا جائے ——— جوش ایک آرٹسٹ ہے خطوط کا اور اقبال فنکار ہے، رنگوں کے مزاج کا، جوش کے یہاں سنگستانی ندی کا شور و ہنگامہ ہے اور اقبال کے یہاں اوقیانوس کا سا سکون و عمق۔ جوش کا کلام بازیگاہ ہے الفاظ کا، اقبال کا کلام ایک طلسم کدہ ہے معنویت کا، جوش کی شاعری ایک منظر ہے کبوتروں کی ایک ٹکڑی کا جو فضا میں چکر لگا کر چھتری پر آکر بیٹھ جاتی ہے، اقبال کی شاعری ایک عقاب کی سی پرواز ہے جس کے تعاقب میں پہلے ہماری نظریں کھو جاتی ہیں اور پھر ہم خود۔ جوش "از صحن خانہ تا بلب بام" ازانِ من" کا شاعر ہے اور اقبال "از بام خانہ تا ثریا" کا۔ اس لئے یہ غلطی ہے کہ ان دونوں کا معائنہ کر کے ایک کا تفوق دوسرے پر ظاہر کیا جائے، جوش کے میدان میں اقبال کا گذر نہیں، اقبال کی جولانگاہ میں جوش کا نفوذ و اثر نہیں۔ دیوار کے نقش و نگار کو کھڑے ہو کر دیکھنا اور پسِ دیوار پہونچکر دیوار کے نقش و نگار کو دیکھنا دونوں بے محل باتیں ہیں۔ (نیاز)

فنِ تحریر کی ایجاد سے پہلے

(بہ سلسلۂ گزشتہ)

اس میں شک نہیں عہدِ قدیم کا انسان جب وہ کوہ و بیابان میں زندگی بسر کرنے پر مجبور تھا، بہت وحشی و ناتراشیدہ تھا تاہم درندوں اور جانوروں سے ضرور مختلف تھا، یعنی جانوروں میں ایک قدرتی (INSTINCT) کے علاوہ اور کوئی قوت غور و فکر کی نہ پائی جاتی تھی اور انسان سمجھ بوجھ کی صلاحیت لیکر آیا تھا، وہ سوچ سکتا تھا، سوچنے کے بعد کسی نتیجہ پر پہونچنے کی کوشش کرتا تھا اور دوسروں تک اپنے دل کی بات پہونچانے کی خواہش اس کے اندر پائی جاتی تھی، اس کے اندر مختلف جذبات پیدا ہوتے تھے اور وہ ان جذبات کے اظہار کی بھی کوشش کرتا تھا۔ پھر ہمیں یہ تو نہیں معلوم کہ اولین دور میں اپنے خیالات، دوسروں تک پہونچانے کے لئے اس نے کیا طریقے اختیار کئے، لیکن جب وہ نیم مہذب حالت تک پہونچا تو اس نے اس کے لئے تین طریقے اختیار کئے ایک یہ کہ وہ دوسروں کے پاس کچھ چیزیں بھیج دیتا تھا یا انھیں راستہ میں رکھدیتا تھا اور مقررہ اصول کی بناء پر وہ سمجھ لیتے تھے کہ بھیجنے والے کا کیا مقصد ہے، دوسرا طریقہ یہ تھا کہ وہ ستلی یا کپڑے میں گرہ لگاکر کسی خاص بات کی یاد تازہ رکھتے تھے یا دوسروں تک اسے پہونچا دیتے تھے، تیسرا طریقہ یہ تھا کہ لکڑی وغیرہ پر خاص خاص نشانات بناکر لوگوں کو بھیج دیتے تھے اور انھیں ذرایع سے وہ پیغام رسانی کا کام لیتے تھے۔ آج ہم انھیں تین طریقوں پر گفتگو کرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ان طریقوں سے اظہار خیال یا پیامرسانی کا تعلق کان اور آنکھ دونوں سے ہوسکتا تھا۔ یعنی یا تو کوئی آواز پیدا کرکے کوئی خاص مطلب ادا کرنا جس میں سنکھ، سیٹی، بگل، ہارن اور ڈھول وغیرہ کی آوازیں شامل ہیں، یا کسی اشارہ سے کام لینا، جیسے چشم و ابرو یا دیگر اعضاء کی جنبش و حرکت یا آگ، دھویں اور جھنڈے وغیرہ سے کام لینا۔

اشیاء کے ذریعہ سے اظہار خیالات کی سب سے قدیم مثال ہمیں یونانی مورخ ہیروڈوٹس کے بیان میں ملتی ہے وہ کہتا ہے کہ جب دارا شاہ ایران نے سیتھول (SCYTHIANS) کے ملک پر حملہ کیا (۵۱۲ ق-م) تو دشمن کا ایک ایلچی اُس کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے ساتھ ایک چڑیا، ایک چوہا، ایک مینڈک اور پانچ تیر لایا۔ وہ انھیں دیکر جانے لگا تو دارا نے اُسے روک کر پوچھا کہ ان سے کیا مطلب ہے۔ اُس نے کہا، مجھے حکم ہے کہ انھیں دے کر فوراً واپس آجاؤں۔ اگر فارس والوں میں سمجھ ہے تو وہ خود ان کا مطلب سمجھ لیں گے۔

دارا نے رات بھر اس مسئلہ پر غور کیا اور دوسرے دن اپنے افسروں سے کہا کہ میں نے سیتھی پیغام کا مطلب سمجھ لیا ہے۔ وہ مجھے اپنے وطن کی زمین اور پانی کا (چوہے اور مینڈک) بادشاہ تسلیم کرتے ہیں اور میری بڑی فوج سے خوفزدہ ہوکر بھاگ گئے ہیں (چڑیا) اور اُنھوں نے ہتھیار (تیر) ڈال دئے ہیں۔ لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ اُسی دن رات کو دشمن نے شبخون مارا

۱؎ سیتھی۔ ایک جنگجو قوم جو بحیرۂ اسود کے شمال میں آباد تھی۔ ان لوگوں کو مغلوب کرنے کے لئے دارا ہلسپانٹ (آبنائے دردانیال) کے پار اُترا اور دریائے ڈینوب پر کشتیوں کا پُل باندھ کر اُن کی سرزمین میں داخل ہوا۔ مولانا عبدالحلیم شررؔ "عصرِ قدیم" (مطبوعہ ۱۹۲۸ء) صفحہ ۳۰

جس میں دارا کا سخت نقصان ہوا۔

آخر دارا کو ایک سیتھی افسر سے معلوم ہوا کہ اُن کے پیغام کا اصل مطلب یہ تھا کہ جب تک ایرانی، پرندوں کی طرح ہوا میں اُڑنا یا چوہے کی طرح زمین میں گھُسنا، یا مینڈک کی طرح تہ آب روپوش ہونا نہ سیکھ لیں وہ سیتھی تیروں سے نہیں بچ سکتے۔

یہ ایک تاریخی مثال تھی، لیکن علم الانسان (اینتھراپولوجی) کی کتابوں اور سفرناموں سے پتہ چلتا ہے کہ نیم مہذب اقوام میں اشیاء کے ذریعہ سے خیالات کا اظہار بہت عام تھا۔ مثلاً:

جپسی (GYPSY) خانہ بدوشوں کا طریقہ — اگر اُن کے قافلے میں سے کوئی شخص اپنی گاڑی کے آگے درخت کی خشک شاخ ڈال دیتا تو معلوم ہو جاتا کہ اُن کے یہاں کوئی بیمار ہے۔ اگر شاخ جلی ہوئی ہوتی تو معلوم ہو جاتا کہ کوئی مرگیا ہے اور ہری شاخ ولادت کو ظاہر کرتی۔ اگر برادری کو دعوت دینا مقصود ہوتا تو کھال کا ایک ٹکڑا راستے میں ڈال دیا جاتا اور دعوت کی جگہ متعین کرنے کے لئے اُس میں چوکھنٹے سوراخ کردئے جاتے جس سے معلوم ہوتا کہ اتنے شہروں کے بعد وہ گاؤں ملے گا جہاں دعوت ہے اور اگر یہ سوراخ گول ہوتے تو ان سے مراد گاؤں ہوتے۔ یہ طریقہ کہیں کہیں اب بھی رائج ہے۔

ٹامپسن ہندیوں کا طریقہ — یہ لوگ برٹش کولمبیا میں آباد ہیں۔ ان کے یہاں اگر زمین پر (خیمہ کے سامنے) چار لکڑیاں گڑی ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ چار آدمی اُس طرف گئے ہیں جدھر لکڑیوں کا جھکاؤ ہے۔ اگر وہیں پر گھوڑے کے بال ہوں تو اُنھیں گن کر یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اُن کے پاس کتنے گھوڑے تھے اور اگر گھوڑے کے بالوں سے ہرن کے بال بھی بندھے ہوں تو اس کا مطلب ہوگا کہ وہ اپنے ساتھ ہرن کا گوشت کھانے کو لے گئے ہیں۔ اگر کوئی چھڑی دور پر رکھی ہو اور اُس سے مچھلی کے کانٹے یا جڑیں بندھی ہوں تو اُس کا مطلب ہوگا کہ وہ لوگ بھوکے مر رہے تھے اور مچھلی کے کانٹے اور جڑیں کھا کر دن گزار رہے تھے۔

مشرقی ترکستان — ایک جوان لڑکی نے اپنے محبوب کو ایک تھیلا بھیجا جس میں کئی چیزیں تھیں ان میں ایک چائے کی ٹکیہ تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ "اب مجھ سے چائے نہیں پی جاتی"۔ بھوسے کا ایک تنکا بھی تھا جس سے مقصود یہ ظاہر کرنا تھا کہ "تمھاری محبت میں میرا رنگ زرد ہو گیا۔ ایک سرخ پھول بھی تھا یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ جب میں تمھارا تصور کرتی ہوں تو میرا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک سوکھی ہوئی خوبانی سے یہ مفہوم لیا گیا "میں اس پھل کی طرح سوکھ گئی ہوں" کوئلے کے ٹکڑے سے یہ ظاہر کیا گیا "میرا دل تمھاری محبت میں جل رہا ہے"۔ ایک پھول سے مراد لی گئی "تم اس کی طرح حسین ہو" شکر کی ڈلی سے یہ بتایا گیا کہ "تم بہت شیریں ہو"۔ پتھر کے ایک ٹکڑے سے یہ ظاہر کیا گیا کہ "تمھارا دل پتھر کا ہے"، اور باز کے ایک پر سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ "اگر میرے پر ہوتے تو میں تمھارے پاس اُڑ کر پہونچ جاتی"۔

اوپر کی مثالوں میں اشیاء اور اُن کے ذریعہ سے ظاہر کئے جانے والے خیالات میں کچھ نہ کچھ تعلق موجود ہے، لیکن بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اشیاء اور خیالات میں کوئی تعلق نہیں ہوتا، لیکن یہ فرض کر لیا جاتا کہ فلاں چیز سے فلاں خیال مراد ہے مثلاً یوربا کے جیبو قوم کے لوگوں میں رواج ہے کہ وہ کوڑیوں کو مختلف وضع سے ملا کر تاگوں میں پرو لیتے ہیں اور ان سے مختلف مطالب ظاہر کئے جاتے ہیں۔ یہ کوڑیاں سرداروں کے پاس بطور خط کے بھیجی جاتی ہیں

کسی حد تک ہم لوگ بھی اشیاء کے ذریعہ سے خیالات کا اظہار کرتے ہیں جیسے کسی بڑے آدمی کے مرنے پر جھنڈا نیچا کرنا، شادی میں بلاوے کے طور پر ہلدی وغیرہ بھیجنا یا شادی کے دعوت نامے پر ہلدی کا رنگ لگانا اور موت سے مطلع کرنے والے خط کا ایک کونا پھاڑنا یا اُس کے گرد سیاہ حاشیہ کھینچنا۔

رنگوں سے کئی طرح کے خیالات وابستہ ہیں سیاہ رنگ موت اور غم کی علامت ہے، سفید اور سبز رنگ سکون کے مظہر سمجھے

جاتے ہیں۔ زرد بیماری کی اور سُرخ رنگ خون اور خطرے کی نمائندگی کرتا ہے۔

ہندو کام شاستر کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ صنفی تعلقات کے سلسلہ میں بھی جذبات کا اظہار اشیاء سے کیا جاتا تھا مثلاً اگر سُپاری (دل کی علامت) کے بیچ میں تیر کا نشان کٹا ہوتا تو اس کا مطلب محبت کی زیادتی ہوتی لیکن اگر وہ بیچ سے ٹوٹی ہوتی اور اُس کے گرد ایک سیاہ دھاگا لپٹا ہوتا تو اس سے تعلقات محبت کا منقطع ہونا مراد لیا جاتا۔

ان تفصیلات سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ فنِ تحریر کی ایجاد سے قبل انسان اظہار خیال کے لئے کتنی زحمتیں برداشت کرتا تھا اور انھیں زحمتوں کو دور کرنے کے لئے اس نے بعد کو تصویری رسم خط ایجاد کیا جس کا ذکر آگے آئے گا۔

۲- گرہوں کی یادداشت۔ اگرچہ زمانۂ قدیم میں مذہبی لٹریچر کو زبانی یاد رکھنے کا رواج عام تھا۔ لیکن روز کی زندگی میں اکثر باتوں کو وہ گرہوں کی مدد سے بھی یاد رکھتے تھے چنانچہ "بات کو گرہ میں باندھنا" مشہور محاورہ ہے، بات کو یاد رکھنے کے لئے بھلکڑ مرد رومال میں اور عورتیں آنچل میں گرہ لگاتی ہیں۔ حالی نے مرزا غالب کے متعلق لکھا ہے کہ "وہ اکثرات کو عالم سرخوشی میں فکر کیا کرتے تھے اور جب کوئی شعر سرانجام ہوجاتا تھا تو کمربند میں ایک گرہ لگالیا کرتے تھے۔ اسی طرح آٹھ آٹھ دس دس گرہیں لگاکر سورہتے تھے اور دوسرے دن یاد پر سوچ کر تمام اشعار کو قلمبند کرلیا کرتے تھے" (یادگارِ غالب)

ہندوستان کے بعض گھرانوں میں یہ رواج ہے کہ جب بچہ ایک سال کا ہوجاتا ہے تو کسی دھاگے میں ایک گرہ لگادیتے ہیں جیسے "سالگرہ" یا "ورش گانٹھ" کہتے ہیں۔ اسی طرح ہر سال ایک نئی گرہ لگائی جاتی ہے۔ اور گرہوں کو دیکھ کر بتایا جاسکتا ہے کہ جس کے نام کا وہ تاگا ہے اُس کی عمر کیا ہے۔

اصل میں یہ طریقہ اُس زمانہ کی یادگار ہے جب انسان لکھنا نہیں جانتا تھا۔ اُس وقت گنتی اور ضروری باتوں کو گرہ کے ذریعہ یاد رکھتے تھے۔ گرہوں کا استعمال کتنا عام تھا، یہ بات ذیل کی مثالوں سے ظاہر ہوگی۔

یونانی مورخ ہیروڈوٹس لکھتا ہے کہ دارا نے چند یونانیوں کو دریائے ڈینوب کے ایک پل پر متعین کیا اور اُنھیں ایک چرمی تسمہ دیا جس میں دو مہینہ کے لئے ساٹھ گرہیں پڑی ہوئی تھیں۔ اُس نے کہا "یونان کے لوگو! اس تسمہ کو اپنے پاس رکھو اور جیسا میں کہوں ویسا کرو، میرے سیتھوں کے مقابلہ پر جانے کے بعد ہر دن ایک گرہ کھولنا اور جب ساری گرہیں کھل جائیں اور میں واپس نہ آؤں تب تم اپنے وطن کو واپس چلے جانا لیکن اس سے قبل نہیں"۔

مشہور چینی فلسفی لاؤتشہ اپنی کتاب "تاؤتیہہ کنگ" (زمانۂ تصنیف چھٹی صدی ق-م) میں لکھتا ہے:- لوگوں کو گرہ دار ستلیوں (چیہہ شنگ) کی طرف پھر جانے دو تاکہ وہ اُن کا استعمال کریں"۔

چین کے علاوہ تبت اور بعض دوسرے ملکوں میں بھی گرہ دار ستلیاں کام آتی تھیں۔ اور پیرو (جنوبی امریکہ) کے قدیم باشندوں میں تو یہ رسم انتہائی ترقی کو پہونچ چکی تھی۔ اُن کا طریقہ یہ تھا کہ ایک موٹی رسّی میں بہت سے دھاگے جھالر کی طرح باندھ دیتے جو کئی گچھوں میں منقسم ہوتا۔ ہر گچھے کے درمیان کچھ فصل ہوتا اور ہر گچھے میں دھاگوں کی تعداد برابر ہوتی۔ یہ دھاگے سفید یا رنگین ہوتے۔ اُن میں سُرخ دھاگا سپاہی کی، زرد سونے کی، سفید چاندی کی اور سبز اناج کی علامت تھا، ان دھاگوں میں مختلف طرح سے گرہیں لگائی جاتی تھیں اور کبھی کبھی تاگوں کو آپس میں ملاکر مختلف شکلیں بنائی جاتی تھیں جن میں سے ہر گرہ اور ہر شکل ایک خاص واقعہ کی طرف اشارہ کرتی تھی۔ ان جھالروں کو "کوپیس" یا "کویپو" کہتے تھے جس کے لفظی معنی "گرہ" کے ہیں۔

اول اول ان گرہوں سے گنتی یا تعداد کا شمار رکھا جاتا تھا، بعد کو تاریخی واقعات، قوانین اور فرمانوں کو بھی اسی طرح محفوظ کیا جانے لگا۔ انھیں پیغام رسانی کے لئے بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ ہر قصبہ میں ایک "گرہوں کا عہدہ دار" (کویپو کامایوکونا)

ہوتا تھا جس کا کام یہ تھا کہ وہ دوسرے مقامات کو بھیجنے کے لئے قوئیپو بنائے اور وہاں سے آنے والے قوئیپو کو دیکھ کر اُن کا مطلب بتائے جب یہ قوئیپو کسی دور دراز کے صوبے سے آتے تو لانے والے کی زبانی ہدایات کے بغیر انھیں سمجھنا مشکل ہو جاتا۔

زمانۂ قدیم کے بہت سے قوئیپو ابھی تک محفوظ ہیں۔ اُن میں سے ایک کا وزن ۱۲ یا ۱۴ پونڈ ہے۔ لیکن اب وہاں کے لوگ قوئیپو کا بنانا اور سمجھنا بھول گئے ہیں۔ اس لئے ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ ان "گرہوں" میں کیا کیا راز پنہاں ہیں۔

اب وہاں کے باشندوں میں صرف پونا کے گلہ بان اپنے مویشیوں کی تعداد یاد رکھنے کے لئے گرہوں کا استعمال کرتے ہیں۔ قوئیپو کی پہلی رسّی پر وہ بیلوں کو ظاہر کرتے ہیں اور دوسری پر گایوں کو۔ اور پھر اس کے دو حصّے کر دیتے ہیں، ایک پر تو اُن گایوں کی تعداد ظاہر کی جاتی ہے جو دودھ دیتی ہیں اور دوسری پر اُن کو جن کا دودھ سوکھ گیا ہے؟ اس کے بعد والی رسّی پر بچھڑے ظاہر کئے جاتے ہیں اور پھر وہ رسّی ہوتی ہے جس پر بھیڑیں ظاہر کی جاتی ہیں۔ اسی طرح وہ دودھ وغیرہ کا حساب بھی قوئیپو کی مدد سے رکھتے ہیں اور یہ سب کچھ دھاگوں کے رنگ اور گرہ لگانے کے انداز پر منحصر ہے۔

کیلیفورنیا کے پالونی ہندی بھی اسی طریقہ پر کاربند ہیں جن کے متعلق ڈاکٹر ہوف مین نے لکھا ہے کہ اُن میں ہر سال کچھ لوگ کمبل بیچنے کے لئے سین جبرئیل بھیجے جاتے ہیں۔ ہر شخص جو کمبل بھیجتا ہے انھیں بٹے ہوئے بالوں یا اون کی دو رسّیاں دیتا ہے تاکہ جب بیچنے والا کمبل بیچے تو ایک رسّی پر ایک گرہ کمبل کے لئے لگا دے اور دوسری رسّی پر ریل (سکّہ کا نام) کے لئے جو اُسے کمبل کی قیمت کے طور پر ملے۔ جب اُس کے پاس دس ریل یعنی ایک ڈالر ہو جاتا ہے تو وہ ایک دوہری گرہ لگا دیتا ہے۔ جب یہ لوگ کمبل بیچ کر واپس لوٹتے ہیں تو کمبل دینے والے فوراً آجاتے ہیں اور گرہ دار رسّیوں کو دیکھ کر دام لے لیتے ہیں۔

اسی طرح بعض نیم مہذب اقوام روزانہ گفتگو میں تعداد کا اظہار گرہوں سے کرتی ہیں مثلاً افریقہ کے اُس حصّہ میں جو ٹینگانیکا کے نام سے مشہور ہے مکونڈے نامی ایک قبیلہ آباد ہے۔ ان لوگوں میں اظہارِ اعداد کی جو صورت ہے اُسے یوں سمجھئے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو رسّی کا ایک فٹ لمبا ٹکڑا دیا جس میں گیارہ دن کے لئے گیارہ گرہیں پڑی ہوئی تھیں اور کہا کہ اس سے مراد آج ہے جب میں جا رہا ہوں، دوسری کو چھوتے ہوئے بتایا کہ میں راستے میں ہوں گا تیسری اور چوتھی گرہ کو چھوڑ کر بتایا کہ میں ان دنوں میں برابر چلتا رہوں گا اور پانچویں گرہ کو پکڑ کر بتایا کہ میں اس دن اپنی منزل پر پہونچ جاؤں گا۔ اسی طرح چھٹی گرہ سے قیام کا دن اور ساتویں گرہ سے واپسی کا دن ظاہر کیا اور اپنی بیوی سے کہا کہ ہر دن ایک گرہ کھولنا بھول نہ جانا اور دسویں دن تمھیں میرے لئے کھانا پکانا ہوگا کیونکہ گیارھویں دن میں واپس آجاؤں گا۔

ہندوستان کا ایک واقعہ ملاحظہ ہو:۔ ۱۸۷۲ء میں سنتھال لوگوں کو سنتھال پرگنہ کی مردم شماری کرنا تھی۔ اُن کے سردار نے چار رنگ کی چار ڈوریاں لیں، سیاہ، سرخ، سفید اور زرد، سیاہ سے مراد جوان مرد تھے، سرخ سے جوان عورتیں سفید سے لڑکے اور زرد سے لڑکیاں۔ وہ ہر گھر پر جاتا اور رسّی میں ضروری گرہیں ڈال لیتا۔ اس طرح اُس نے سارے علاقہ کی آبادی کا شمار کر لیا۔ اُس کا یہ کارنامہ مدراس کے عجائب خانہ میں اب بھی محفوظ ہے۔

الغرض گرہوں کے ذریعہ سے گنتی اور ضروری باتوں کو یاد رکھنے کا رواج زمانۂ قدیم سے بہت عام تھا اور اب بھی بہت سی نیم مہذب قومیں جیسے ہیناؤ کے لی، بنگال کے سنتھال، جزائر جاپان جزایر پولی نیشیا، وسطی اور مغربی افریقہ، کیلیفورنیا اور جنوبی پیرو کی بعض اقوام میں رائج ہے۔ کسی حد تک یہ طریقہ جزائرِ سلیمان، کیرولائن، پے لو اور مارکوئس جزائر میں بھی مستعمل ہے۔

۳ - کٹاؤ دار چھڑیاں ــ جس طرح گنتی کو یاد رکھنے کے لئے رسّیوں میں گرہیں لگائی جاتی تھیں۔ اُسی طرح پتھر، لکڑی اور ہڈی وغیرہ پر کھڑے یا آڑے نشانات بنائے جاتے تھے۔ یہ ترکیب بہت پرانی ہے۔ جنوبی فرانس کے پاس ایک مقام ہے:۔ (Maod'Azil.) - یہاں پر عہدِ حجری کے درمیانی زمانہ (Mesolithic Age) کی تہذیب کا انکشاف ہوا

ہوا ہے اور چند پتّھر کے ٹکڑے ملے ہیں جن پر منجملہ دیگر نشانات کے سیدھی لکیریں بھی کھنچی ہوئی ہیں اور قیاس غالب یہی ہے کہ اُن سے مراد اعداد ہیں۔

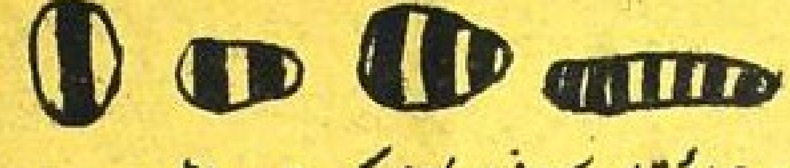

اسی طرح اسپین کے ایک غار میں جو زمانۂ قدیم کے انسان کا مسکن تھا رینڈیر (ہرن) کے سینگ کا ایک ٹکڑا ملا ہے جس پر کسی سخت چیز (غالباً پتّھر) سے سیدھی لکیریں کھینچی گئی ہیں۔ ان سے غالباً شکار یا دنوں کی تعداد مراد ہے۔

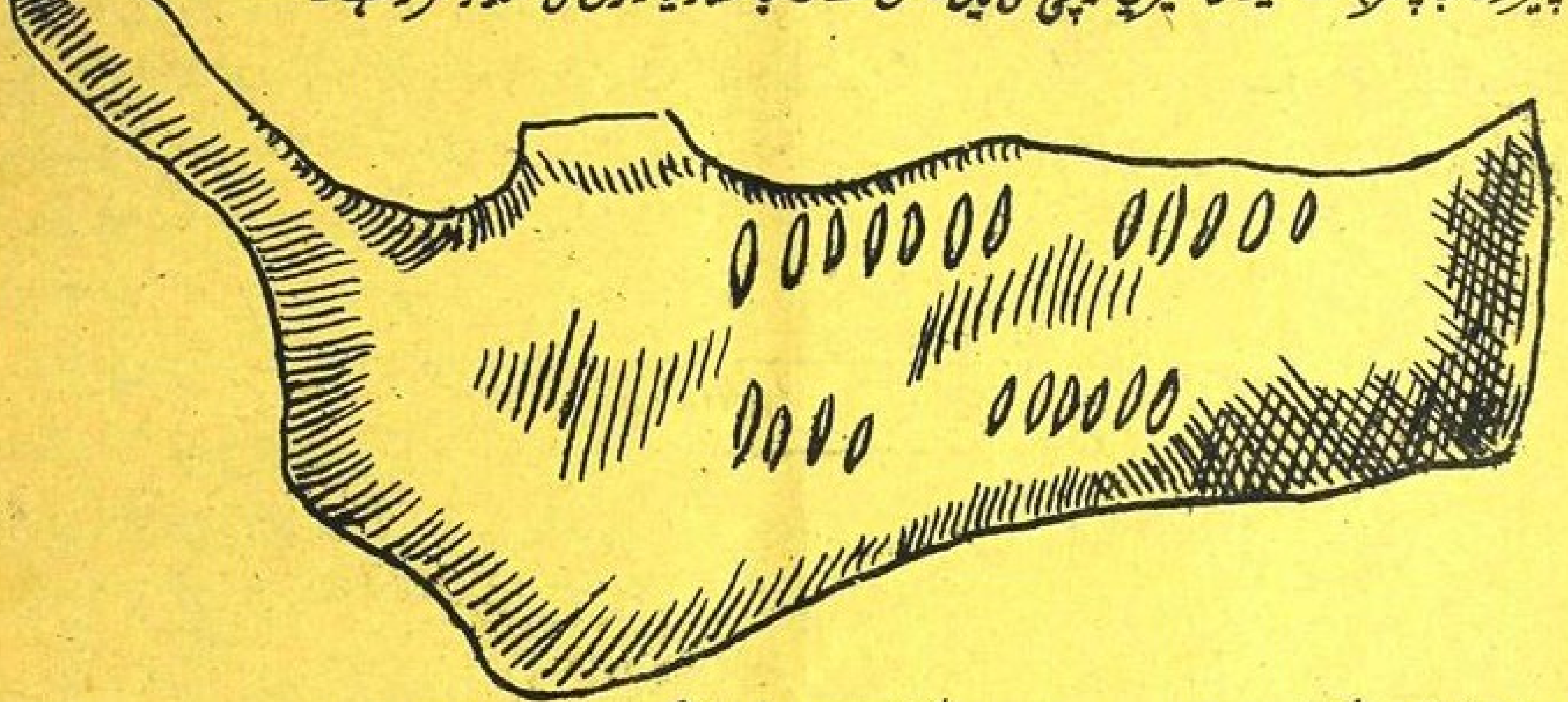

مصر قدیم کے بعض نقوش سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں لکڑی پر دندنے بنا کر گنتی کو یاد رکھا جاتا تھا:-

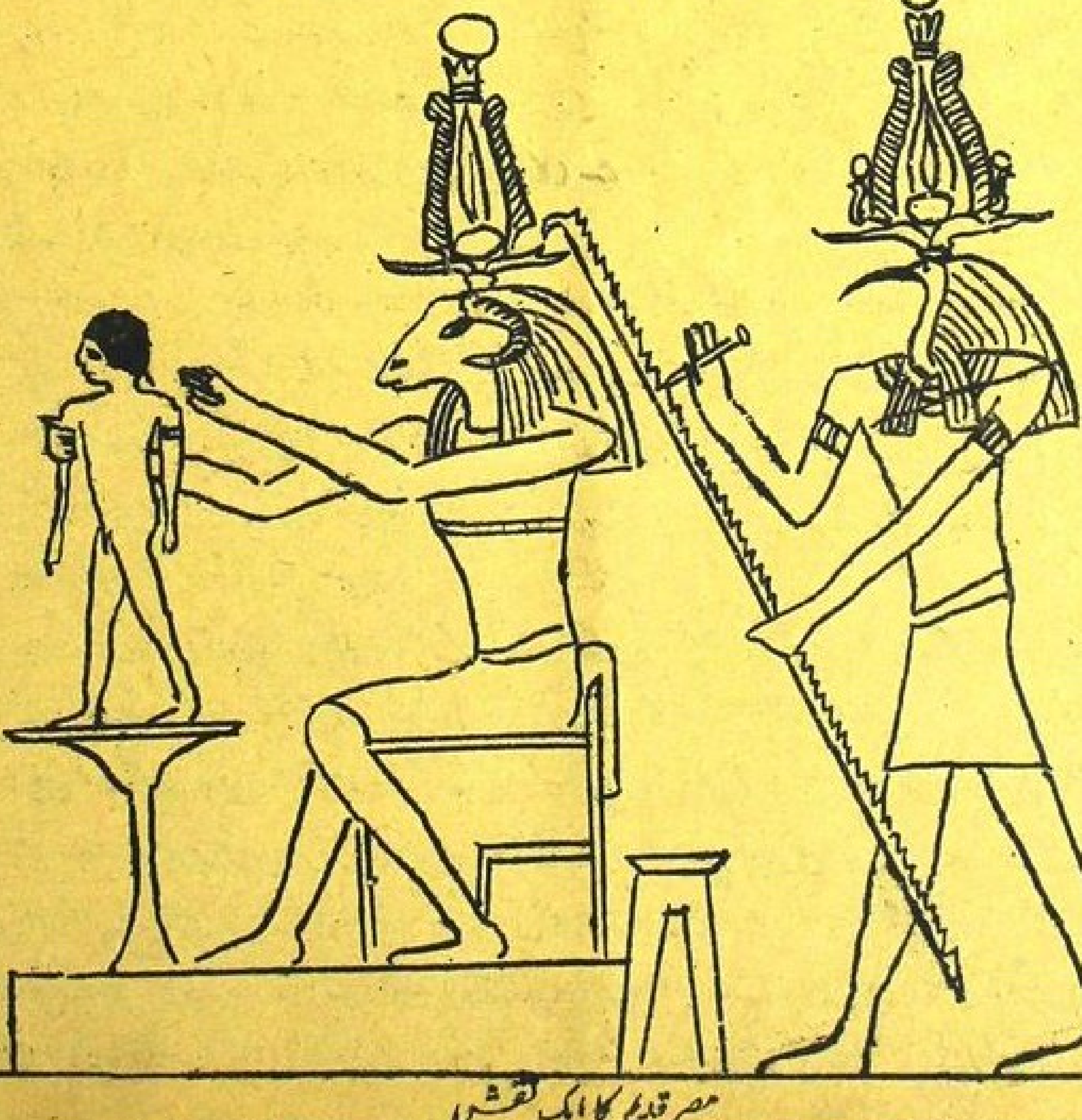

مصر قدیم کا ایک نقش

(قوم دیوتا (خالق) انسان کو بنا رہا ہے اور تھاتھ (فنِ تحریر کا موجد) اُس کی عمر متعین کر رہا ہے)

قرونِ وسطیٰ کے یورپ میں کٹاؤ دار چھڑیوں سے روپیہ کا حساب رکھتے تھے۔ عموماً بد (WILLOW) یا ہیزل (HAZEL) کی لکڑی پر دندانے بنائے جاتے تھے۔ بڑے نشانات ۱۰۰۰ پونڈ، اُن سے چھوٹے ۱۰۰ پونڈ اور اُن سے چھوٹے ۱۰ پونڈ ظاہر کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اُن پر شلنگ اور پینس بھی ظاہر کئے جاتے تھے۔ روپیہ کے لین دین کے وقت ۸ یا ۱۰ انچ لمبی پٹری یا قلم لیا جاتا۔ اس پر رقم کے مطابق دندانے بنائے جاتے اور جہاں پر نشانات ختم ہوتے وہاں لکڑی کے ایک پہلو میں گہرا خط دیدیا جاتا (چوڑائی میں) اور پھر لمبائی کی طرف سے اُسے چیر کر دو ٹکڑے کر دیتے جن میں سے ایک روپیہ لینے والا رکھتا اور دوسرا روپیہ دینے والا، جب روپیہ لوٹایا جاتا تو روپیہ لینے اور دینے والے ان کٹاؤ دار لکڑیوں کو آپس میں ملا کر دیکھتے تھے۔

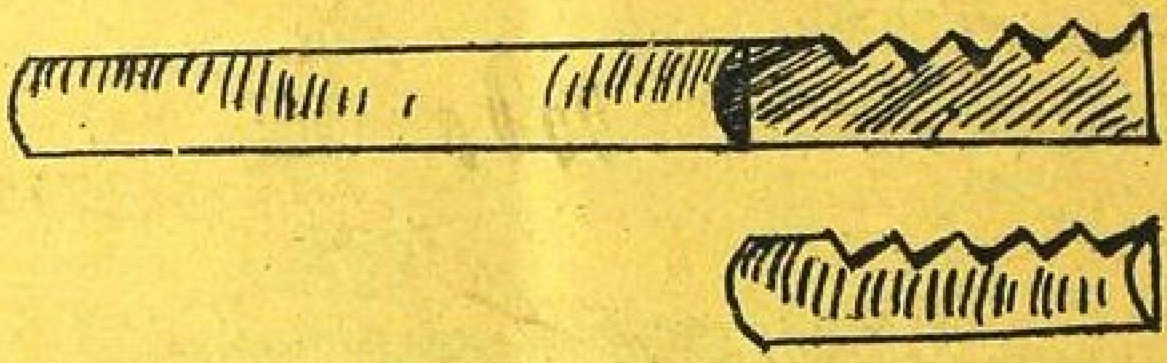

حساب ملانے کو انگریزی میں "TALLY" کرنا کہتے ہیں لیکن بہت کم لوگوں کو اس کی اصلیت معلوم ہوگی کہ اصل میں "ٹیلی" کٹاؤ دار چھڑیوں کو کہتے تھے۔ خود اس لفظ کا ماخذ یا تو فرانسیسی زبان کا لفظ (TAILLER) ہے جس کے معنی کاٹنا ہیں اسی سے انگریزی کا لفظ "TAILOR" نکلا ہے بہ معنی درزی) یا لاطینی زبان کا لفظ "TALEA" جس کے معنی پتلی شاخ کے ہیں۔ غالباً یہی لفظ ہندوستان میں "تیلی" (تنکا) ہے

شکسپیر اپنے ایک ڈرامے میں لکھتا ہے:۔

"Our fore fathers had no other books
but the Score and the tally."

2, Henry, VI, IV,, vii, 38

"اسکور" کے اصلی معنی نشان کے ہیں جو کسی چیز پر کاٹ کر بنایا جائے لیکن چونکہ پہلے حسابی قلموں پر بیسواں نشان زیادہ گہرا اور بڑا کاٹا جاتا تھا اس لئے اسکور کے معنی بیس کے بھی ہو گئے۔

اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ عوام کے علاوہ انگلستان کا "بینک آف ایکسچکر" بھی کٹاؤ دار چھڑیوں کا استعمال کرتا تھا۔ جب کوئی شخص روپیہ جمع کرتا تو رسید کی جگہ اُسے ایک لکڑی کا ٹکڑا ملتا جس پر رقم کے لئے نشانات بنے ہوتے جارج سوم کے زمانہ میں کسی شخص نے اِس کی مخالفت کی اور یہ سوال اُٹھایا کہ جب ہمیں لکھنا پڑھنا آگیا ہے تو پھر ان کے استعمال کی کیا ضرورت ہے۔ آخر بڑی ردو قدح کے بعد ۱۸۲۶ء میں یہ رسم منسوخ ہو گئی لیکن ۱۸۳۴ء میں پھر یہ سوال پیدا ہوا کہ بینک میں اس قسم کی سڑی گلی اور کرم خوردہ لکڑیوں کا جو انبار لگا ہے۔ اُس کا کیا ہو؟ کتنا اچھا ہوتا اگر انھیں غریب لوگوں میں جلانے کے لئے تقسیم کر دیا جاتا مگر انھیں قانوناً بینک سے باہر نہ جا سکتے تھے۔ لہٰذا یہ قرار پایا کہ انھیں پارلیمنٹ ہی کے کسی حصے میں جمع کر کے خفیہ طور پر جلا ڈالا جائے اور جب اس حکم پر عملدر آمد ہو رہا تھا تو پارلیمنٹ کی عمارت میں آگ لگ گئی

(۱۶ ر اکتوبر ۱۸۳۴ء کو بروز جمعرات شام کو ۷ بجے سے کچھ قبل) دارالامرا اور دارالعوام دونوں جلکر خاک ہوگئے اور انکو دوبارہ تعمیر کرنے میں لاکھوں روپیہ صرف ہوا۔ اس حادثہ کا چارلس ڈکنس نے اپنی ایک تقریر میں بڑا مذاق اُڑایا ہے۔

خیر یورپ سے تو یہ رسم اُٹھ گئی لیکن آج بھی مغربی افریقہ، آسٹریلیا، میلانیشیا، مائکرونیشیا، ہندچین، منگولیا، شمالی مشرقی ایشیا، شمالی امریکہ اور برٹش کولمبا کی نیم مہذب اقوام میں کٹاؤ دار چھڑیوں کا استعمال پایا جاتا ہے۔

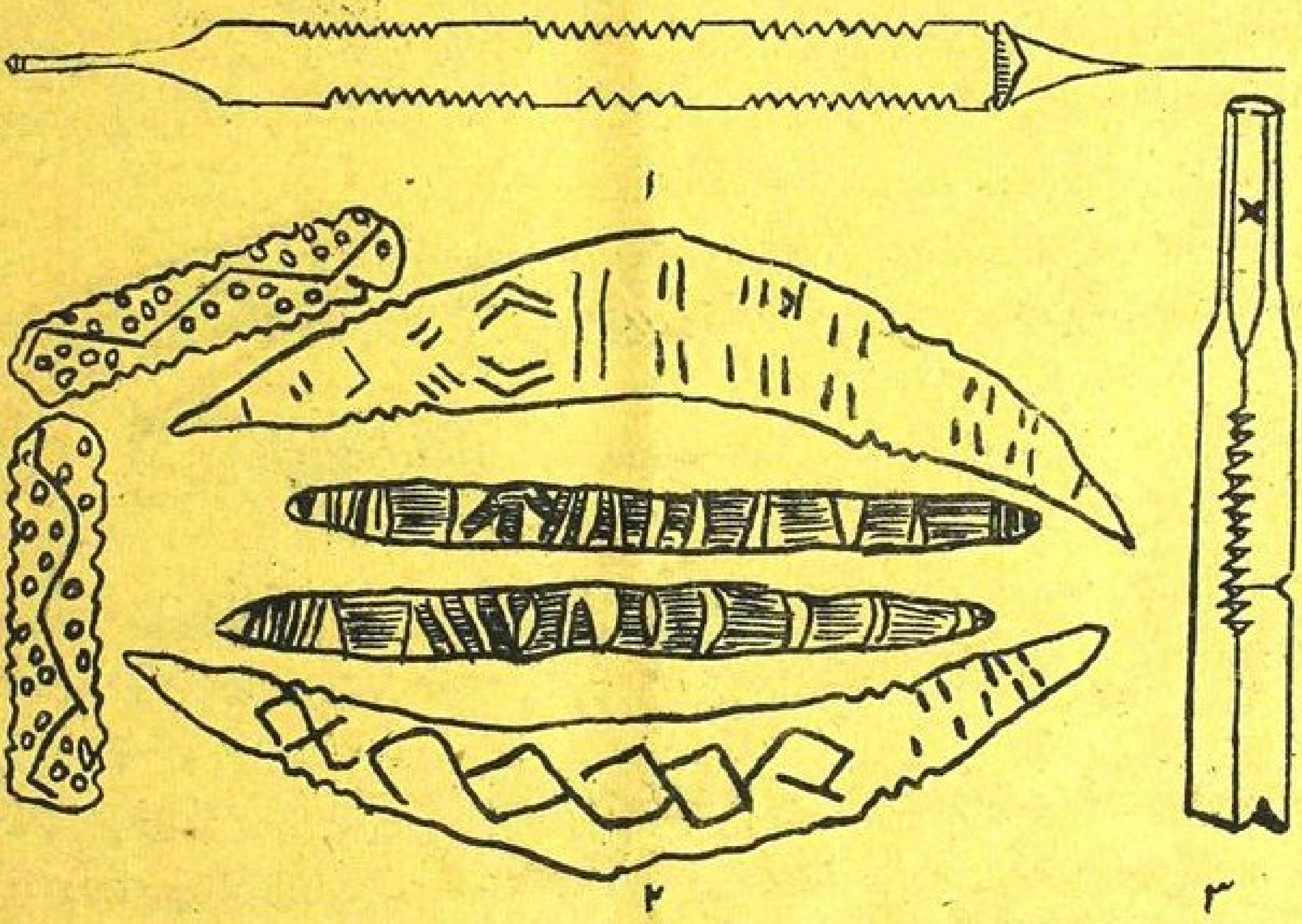

کٹاؤ دار چھڑیاں — ۱- لاؤس (ہندچین) سے، ۲- آسٹریلیا سے - ۳- کیلیفورنیا سے

عموماً کٹاؤ دار لکڑیوں کا استعمال حساب رکھنے کے لئے کیا جاتا ہے لیکن بعض ملکوں میں اُنھیں پیغام رسانی کے لئے بھی استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً آسٹریلیا میں پیشہ ور پیغامبر ہوتے ہیں۔ وہ خبریں سننے جاتے ہیں اور درخت کی ایک ٹوٹی ہوئی شاخ پر سیپ کے کنارے یا چاقو سے نشانات بناتے جاتے ہیں۔ یہ نشانات مختلف وضع کے ہوتے ہیں اور یہ لکڑیاں بھی مختلف ناپ کی ہوتی ہیں، جنھیں جالی کے تھیلوں میں لے جایا جاتا ہے۔ منزلِ مقصود پر پہونچ کر یہ چھڑیاں مرسل الیہ کے حوالے کردی جاتی ہیں اور سارا پیغام سنا دیا جاتا ہے۔ یہ پیغامات کئی طرح کے ہوتے ہیں جیسے کسی دعوت یا مذہبی رسم میں شرکت کا بلاوا یا کوئی تجارتی فرمایش۔ بسا اوقات ان چھڑیوں کو قیدیوں کے پاس بھیجا گیا ہے تاکہ وہ اس سازش سے آگاہ ہو جائیں جو اُنھیں چھُڑانے کے لئے کی گئی ہے۔

اگرچہ سیدھی لکیروں سے اعداد کا اظہار کیا جاسکتا تھا اور آڑے ترچھے خطوط سے ضروری باتیں یاد رکھی جاسکتی تھیں لیکن جب تک انسان نے پیغام رسانی اور یاد دہانی کے لئے تصویروں کا استعمال شروع نہیں کیا فنِ تحریر کی طرف کوئی نمایاں ترقی نہیں ہوسکی۔

فنِ تحریر کی ابتدائی صورت

فنِ تصویر کشی — تصویر کشی کا فن نہایت قدیم ہے۔ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اُس کی ابتدا کس طرح ہوئی۔ ہو سکتا ہے کہ سایہ کشی یا عکس نویسی (SILHOUETTE) یعنی مختلف اشیاء کے سایہ کے گرد لکیر کھینچنے سے اس کا آغاز ہوا ہو۔ مدور اور حجم رکھنے والی چیزوں کی تصویریں بنانے میں یقیناً اس طریقہ سے مدد لی گئی ہوگی۔

تصویر کشی کے قدیم ترین نمونے جدید عصر حجری (NEOLITHIC AGE) کے اُن غاروں میں ملتے ہیں جو اسپین اور فرانس کے مختلف مقامات اور اُن کی سرحد پر واقع ہیں۔ دشتِ ہمارا، سویڈن اور وسطِ ایشیا کی چٹانوں پر نہایت ہی قدیم زمانہ کے نقوش (PETROGLYPHS) پائے گئے ہیں۔ ہندوستان میں ہوشنگ آباد (بھوپال کے قریب) کی بعض چٹانوں پر بھی ایسے نقوش ملتے ہیں۔ جنوبی افریقہ کے بشمین لوگوں کے آبا و اجداد نے غاروں میں تصویر کشی کے نہایت ہی اچھے نمونے چھوڑے ہیں اور اس بات کے ماننے کے کافی وجوہ موجود ہیں کہ مذکورۂ بالا تمام مقامات پر تصویریں بنانے کا مقصد بعض مذہبی رسوم تھیں جیسا کہ آسٹریلیا کی نیم مہذب اقوام میں نظر آتا ہے۔

خود ہمارے ملک میں دیوالی، شادی بیاہ اور بعض دوسرے موقعوں پر عورتیں دیوار یا فرش پر تصویریں بناتی ہیں۔ میں نے حیدرآباد (دکن) میں تلنگا عورتوں کو اپنے دروازہ کے سامنے کی زمین پر نقش و نگار بناتے دیکھا ہے اس آرائش کو وہ "مگو" کہتی ہیں۔ مہاراشٹر اور بمبئی کے علاقہ میں یہی چیز "رنگولی"۔ سیلون میں "کولم" اور بنگال میں "الپونا" کہلاتی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ امر بھی حیرت سے سُنا جائے گا کہ بعض امریکن ہندی (امریکہ کے قدیم باشندے خصوصاً نواجو لوگ) زمین پر بالو بچھا کر خوبصورت تصویریں بناتے ہیں اور وہاں بھی یہ چیز مذہب سے وابستہ ہے۔

مذہبی رسوم کے علاوہ فنِ تصویر کشی کا استعمال آرائش کے لئے وسیع پیمانہ پر کیا جاتا رہا ہے۔ پُرانے زمانہ سے لیکر آج تک برتنوں اور خانگی استعمال کی دوسری چیزوں کو نقش و نگار سے سجاتے آئے ہیں۔ نیم مہذب اقوام میں ٹوکریوں اور چٹائیوں وغیرہ کے بننے میں جو بیل بوٹے بنائے جاتے ہیں وہ بسا اوقات اس قدر پیچیدہ ہوتے ہیں کہ ہمارے اچھے اچھے آرٹسٹ اُن کی نقل اُتارنے میں دقت محسوس کرتے ہیں۔

تصویر کشی کا تیسرا مصرف اظہارِ خیال ہے۔ اس کی سب سے ادنیٰ صورت امتیازی نشانات، نشاناتِ ملکیت اور وہ نشانات ہیں جنھیں رہنمائی یا اطلاع کے لئے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔

امتیازی نشانات — ان کا آغاز اس طرح ہوا کہ پُرانے زمانہ کا انسان سردی، گرمی اور پانی کے اثرات سے بچنے کے لئے اپنے جسم پر چربی اور مٹی وغیرہ ملا کرتا تھا۔ پھر عورتوں کو لبھانے اور دشمنوں کو ڈرانے کے لئے اُن میں رنگ ملانے لگا۔ پہلے سارا جسم پوتا جاتا تھا۔ بعد میں اِدھر اُدھر چند لکیریں بنانا کافی سمجھا گیا۔ بسا اوقات یہ لکیریں سوسائٹی میں اُس شخص کا مرتبہ ظاہر کرتی تھیں۔

ہندوؤں کے قشقے جنھیں سینے۔ شانے اور پیشانی پر بناتے ہیں، اسی قبیل کی چیز ہیں۔ ان کے دیکھنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں شخص وشنو دھرم کا ماننے والا ہے۔ فلاں شیومت کا ماننے والا یا سناتن دھرمی وغیرہ ہو سکتا ہے کہ ان علامتوں کا تصور نیم مہذب اقوام سے ماخوذ ہو اور یا پھر یہ اُس دور کی باقیات ہوں جب اہلِ ہنود تہذیب کے ابتدائی مدارج طے کر رہے تھے۔

چونکہ پہلے انسان کپڑے بہت کم پہنتا تھا (خصوصاً گرم ملکوں میں) اس لئے ایسے نشانات عموماً جسم پر بنائے جاتے تھے۔ رنگوں کے ذریعہ یا گودنا گودا کر۔ لیکن جب اُس نے کپڑے پہننا شروع کر دئے تو پھر ان آرائشی یا امتیازی نشانات کو کپڑوں پر

منتقل کر دیا گیا۔ انھیں کے ساتھ فوجیوں اور ملاحوں کے بِلّوں کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے جن کا تخیل نیم مہذب اقوام کے امتیازی نشانات سے ماخوذ ہے۔

اسی سلسلہ میں مَیں ناظرین کی توجہ ۱۹۵۲ء کے انتخاب (ووٹنگ) کی طرف مبذول کروں گا جس میں ہر پارٹی نے امتیاز کے لئے ایک جداگانہ نشان قرار دیا تھا۔ جیسے کانگریس کا نشان دو بیلوں کی جوڑی، جن سنگھ کا جلتا ہوا چراغ اور کسان مزدور پرجا پارٹی کا جھونپڑا وغیرہ وغیرہ — دوسروں سے اپنے کو ممتاز کرنے کے لئے نیم مہذب اور مہذب اقوام نے نشانات کے علاوہ بعض اور ترکیبوں کا بھی استعمال کیا ہے جیسے بالوں کو مخصوص وضع کا بنانا اور خاص طرح کے گہنے اور لباس پہننا۔ مختلف سیاسی تحریکوں، پیشوں اور ملکوں کے لحاظ سے بھی لباس میں فرق ہوتا آیا ہے۔

نشاناتِ ملکیت — جس طرح ہم اپنی چیزوں پر اپنا نام یا اپنے نام کے پہلے حروف لکھتے ہیں اُسی طرح نیم مہذب اقوام اپنی چیزوں پر اپنا یا اپنے قبیلے کا مخصوص نشان بناتی ہیں۔ عموماً یہ نشانات اُس مذہب سے تعلق رکھتے ہیں جیسے "ٹوٹم ازم" (TOTEMISM) کہتے ہیں اس مذہب کے ماننے والے اپنا رشتہ شجر، حجر اور حیوانوں سے جوڑتے ہیں جن کی تصویر اُن کا مخصوص نشان ہوتی ہے۔

جیسے آج کل گھوڑوں کے داغنے کا رواج ہے اُسی طرح پُرانے زمانہ میں پالتو جانوروں پر کسی نہ کسی طرح کے نشان بنائے جاتے تھے۔ رگوید میں اکثر جگہ ایسی گایوں کا ذکر آیا ہے جن کے کان پر ہنسیے وغیرہ کے نشان بنائے گئے تھے۔ عرب کے بدو اور عراق کے عرب اب بھی ایسے نشانات کا استعمال کرتے ہیں جنھیں "وسم" کہتے ہیں (وسم کے لغوی معنی "نشان" اور "داغ" کے ہیں)

ماضی بعید کے برتنوں پر اظہارِ ملکیت کے لئے بہت زیادہ نشانات کا استعمال کیا جاتا تھا۔ ایسے برتن بحیرۂ روم کے اطراف سے لیکر جنوبی ہند تک پائے جاتے ہیں اور بعض عالموں (خصوصاً سر فلنڈرس پیٹری) کا خیال ہے کہ یہی نشانات حروفِ تہجی کا ماخذ ہیں۔

راہ نما نشانات — ان نشانات کا استعمال نیم مہذب اقوام میں بہت عام ہے۔ خصوصاً اُن لوگوں میں جو خانہ بدوش زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ لوگ اپنے پیچھے آنے والوں کے لئے کچھ نشانات چھوڑتے جاتے ہیں تاکہ آنے والوں کو راستے کے حال سے پوری آگاہی ہو جائے (تصویر کشی کا فن سیکھنے سے پہلے ان لوگوں میں غالباً وہی طریقہ کام میں لایا جاتا رہا ہوگا جس کا میں نے جپسیوں ورڈ ماسیس ہندیوں کی تحت ذکر کیا ہے) — نیم مہذب اقوام سے یہ طریقہ غالباً مہذب اقوام میں منتقل ہوا۔ آمد و رفت کے نشانات جنھیں آپ سڑک کے کنارے موٹر والوں کی اطلاع کے لئے دیکھتے ہیں اسی قبیل کی چیزیں ہیں۔ مثلاً:-

اس طرح جب ایک اسکاوٹ آگے آگے جاتا ہے اور اُس کے ساتھی پیچھے رہ جاتے ہیں تو وہ اپنے دائیں ہاتھ کی طرف کچھ نشانات بناتا جاتا ہے۔ یہ نشانات یا تو زمین کی خاک یا مٹی میں اُنگلی سے بنائے جاتے ہیں اور یا پھر درخت کی شاخوں، گھاس پھوس اور کنکریوں کے ذریعہ سے ایسے نشانات کا دیواروں پر کھریا سے بنانا یا درختوں پر نقش کرنا بُرا سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس طرح وہ آسانی سے نظر نہیں آسکتے۔ اسکاوٹ لوگوں کے بعض نشانات ملاحظہ ہوں:-

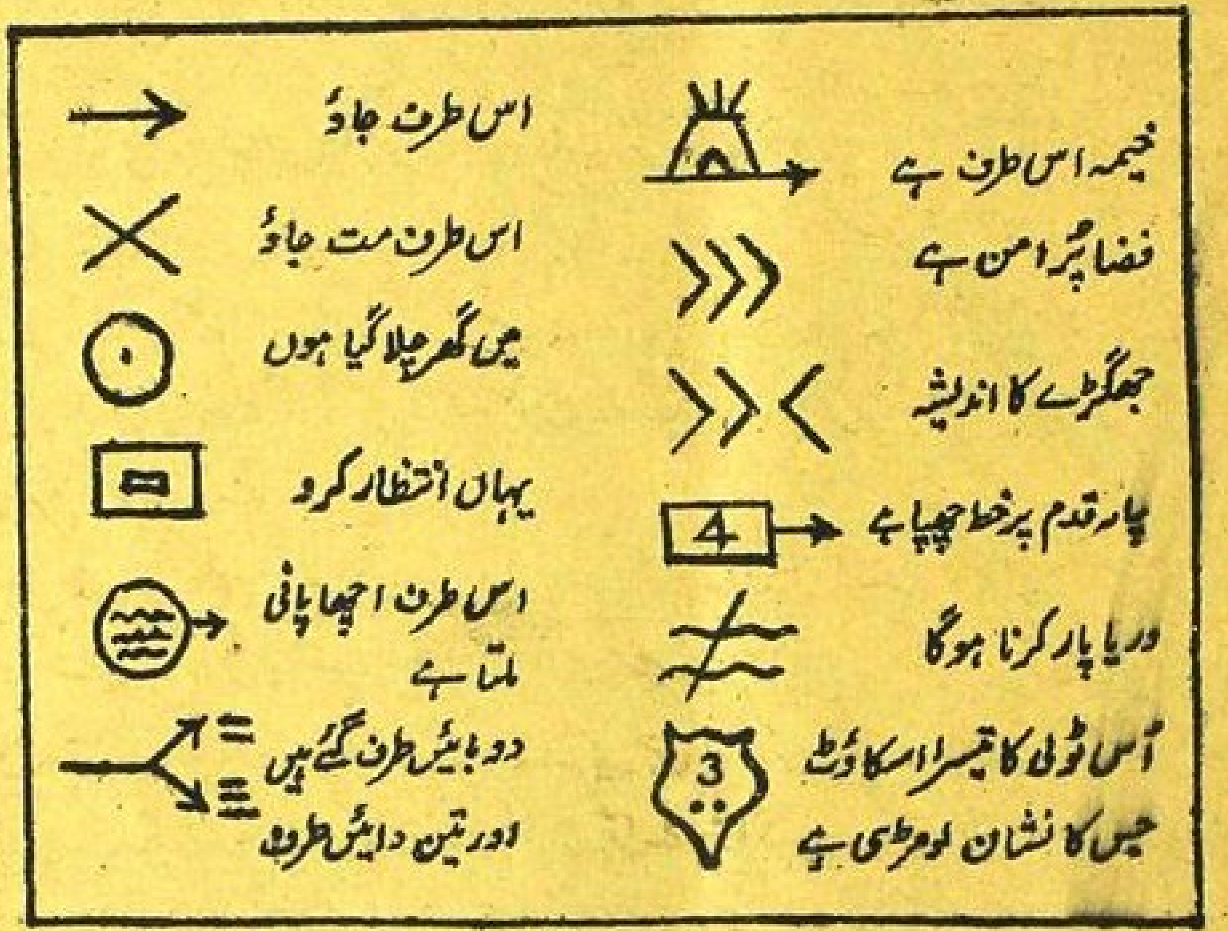

زمانۂ قدیم کے اکثر ملکوں میں تصویری رسم الخط کام میں لایا جاتا تھا، جیسے مصر میں ہیروغلیفی رسم الخط، عراق میں سمیری اور ایشیائے کوچک میں حتی۔ وادیِ سندھ، چین اور کریٹ کے سوا رسوم خط بھی تصویری تھے۔ وسط امریکہ کی مایا اور ازتیق اقوام کا رسم الخط بھی تصویری تھا۔ ان کی ابتدا کس طرح ہوئی اس کا جاننا ہمارے لئے بہت مشکل ہے۔ لیکن یہ بات بالکل قرینِ قیاس ہے کہ ان لوگوں نے اظہارِ خیال کے لئے تصویروں کے باقاعدہ استعمال سے پہلے امتیازی نشانات، نشاناتِ ملکیت، اور راہنما نشانات کا استعمال کیا ہوگا۔

ان کے علاوہ حساب رکھنے کے لئے بھی تصویروں سے مدد لی گئی ہوگی۔ کسی چیز کی تصویر بنا کر اس کے نیچے گنتی کے لئے لکیریں کھینچ کر بڑی خوبی سے حساب رکھا جاسکتا ہے۔ یہ ترکیب اتنی آسان ہے کہ بہت سے بے پڑھے لوگ بغیر کسی کے بتائے ہوئے ازخود اس طریقے پر کاربند ہوگئے ہیں۔

نیم مہذب اقوام کا تصویری رسم الخط

تصاویر کے ذریعہ خیالات کا اظہار شاید ہی کسی دوسری نیم مہذب اقوام میں اس قدر تکمیل کے ساتھ پایا جاتا ہو جتنا شمالی امریکہ کے قدیم باشندوں میں جو سُرخ ہندی یا ہنود احمر (ریڈ انڈین) کے نام سے موسوم ہیں۔ یہ لوگ تصاویر کی مدد سے آپس میں نامہ و پیام کرتے ہیں۔ خرید و فروخت کا حساب رکھتے ہیں اور اہم واقعات کی یادداشت مرتب کرتے ہیں، اُن میں تصویروں کی مدد سے گانوں کو محفوظ کرنے اور مرنے والوں کی قبروں پر الواح نصب کرنے کا بھی چلن ہے۔ نیچے ہم اُن کے تصویری رسم الخط کے چند

نمونے پیش کرتے ہیں۔

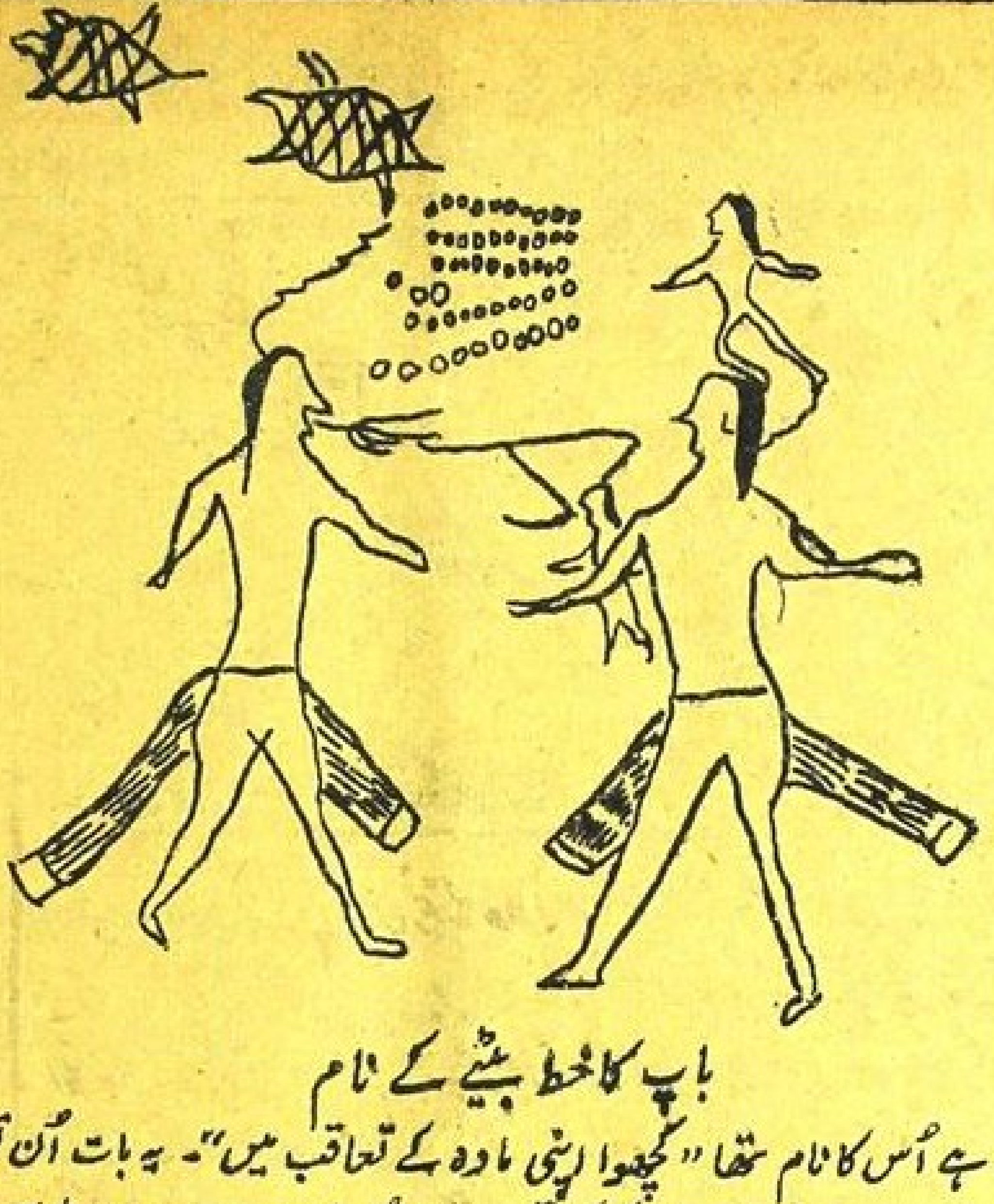

باپ کا خط بیٹے کے نام

بائیں طرف کا آدمی باپ ہے اُس کا نام تھا "کچھوا اپنی مادہ کے تعاقب میں"۔ یہ بات اُن تصاویر سے ظاہر ہے جنھیں ایک لکیر کے ذریعہ اُس کے سر سے ملایا ہے۔ داہنی طرف لڑکے کی تصویر ہے اُس کا نام تھا "چھوٹا آدمی"۔ باپ کے منہ سے نکلی ہوئی لکیریں چھوٹے آدمی کو اپنی طرف گھسیٹ رہی ہیں گویا اُسے بلایا جا رہا ہے۔ اُن کے درمیان چھوٹے چھوٹے دائرے ڈالر کی علامت ہیں۔ اس خط کا مطلب ہے کہ میں تمھیں ۵۳ ڈالر سفر خرچ کے لئے بھیج رہا ہوں تم فوراً چلے آؤ۔

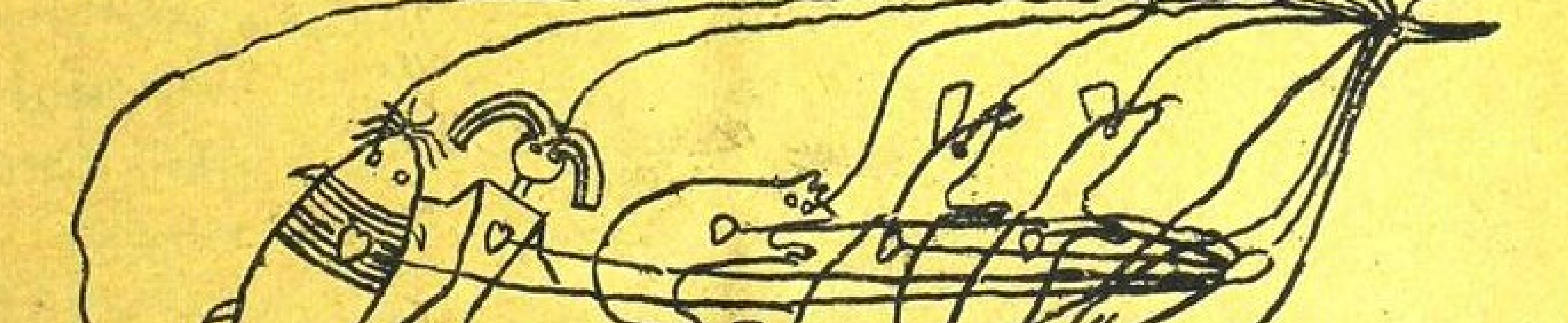

(محضر بنام صدر ریاستہائے متحدہ امریکہ)

اس محضر کو امریکن ہندیوں کے بعض قبیلوں نے ایک چھوٹی جھیل حاصل کرنے کے لئے صدر موصوف کو جنوری سنہ ۱۸۴۹ء میں بھیجا تھا۔ درخواست دینے والے جانوروں میں سب سے آگے ان کا سردار سارس ہے۔ اُس کے سر پر لہراتی ہوئی لکیر اُس جھیل کی طلب کا اظہار کرتی ہے جسے ایک طویل خط کے ذریعہ اُس کے سر سے ملایا ہے۔ دوسرے جانوروں کے دلوں اور

آنکھوں کے سردار کے دل اور آنکھ سے ملانے کے معنی یہ ہیں کہ جملہ قبیلے سردار کے ہم خیال ہیں اور سب کی دلی خواہش یہ ہے کہ انھیں مطلوبہ جھیل مل جائے۔ ایک اور نقش ملاحظہ ہو:-

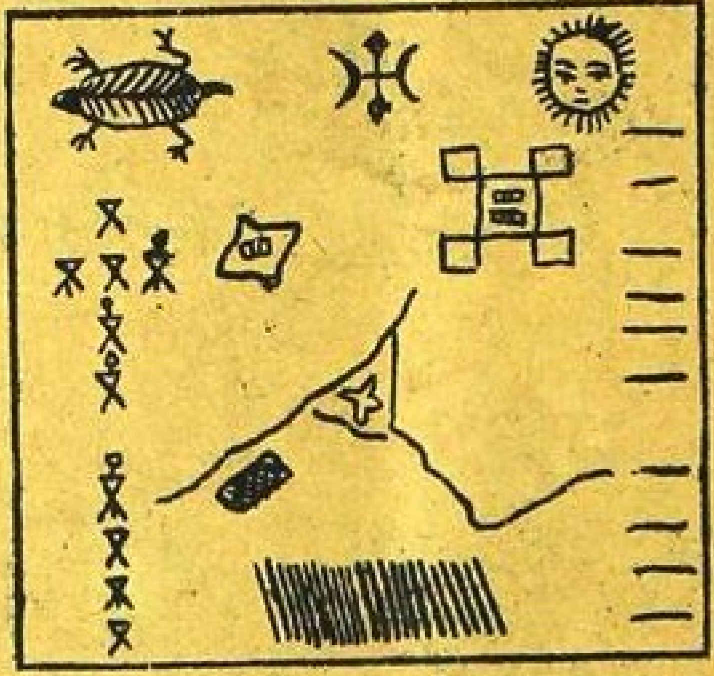

دلاورے خاندان نے اپنے سردار دیج منڈ کی اُس فتح کا حال جو اُس نے انگریزوں کے خلاف ۱۷۶۲-۶۳ء میں حاصل کی تھی اوہیو ریاست میں ایک پیڑ کی چھال پر تصویروں میں کندہ کیا تھا۔ اس میں نیچے کی طرف ۲۷ متوازی لکیریں سپاہیوں کا اظہار کرتی ہیں۔ جو میدانِ جنگ کو جا رہے ہیں۔ سورج کے نیچے کھنچی ہوئی لکیریں اس سے پہلے میدانِ جنگ میں گئی ہوئی دو فوجوں کے کوچ کو ظاہر کرتی ہیں۔

تصویر کے وسط میں تین انگریزی قلعے ہیں۔ دریائے سنگم پر واقع ہونے والے قلعہ کا نام "فورٹ پٹ" ہے۔ داہنی طرف والا قلعہ جس میں دو تجارتی کوٹھیاں ہیں "دیترائے" کا ہے اور تیسرا قلعہ ایری جھیل میں واقع ہے بائیں طرف جو دس انسانی شکلیں ہیں اُن میں ۶ بے سر والے مقتولین کو ظاہر کرتے ہیں اور چار سر والے اُن مرد اور عورتوں کو جو قید کر لئے گئے۔ (مردوں کو عورتوں سے ممتاز کرنے کے لئے اُن کی ٹانگوں کے درمیان ایک لکیر کھینچی ہے) کچھوا غالباً خاندانی علامت ہے۔ ایک اور نقش یہ ہے:

یہ تصویریں سوپیریر جھیل کے پاس ایک چٹان پر بنی تھیں۔ اس میں ایک سردار کے جھیل پار کرنے کا حال ہے۔ سردار کا نام "کنگ فشر" تھا جسے اس نام کی چڑیا سے اوپر (بائیں طرف) ظاہر کیا ہے۔ اُس کے ۱۵ سپاہی ۵ کشتیوں میں سوار تھے اس سفر میں ۳ دن لگے جسے سورج کے تین مرتبہ نکلنے ڈوبنے سے تعبیر کیا ہے۔ کچھوا خشکی یعنی منزلِ مقصود کا مظہر ہے۔

امریکن ہندیوں کی ایک شاخ ڈیکوٹا کے نام سے مشہور ہے۔ اُن کے وہاں سالوں کا شمار بہت دلچسپ طریقہ سے کیا جاتا ہے یعنی وہ ہماری طرح کسی اہم واقعہ کے بعد سے سالوں کا شمار نہیں کرتے۔ اُن کا سال جاڑے سے شروع ہوتا ہے اور اُس جاڑے کے خاص واقعہ سے منسوب کر دیا جاتا ہے۔ اُن میں سے ایک شخص مسمّیٰ "لون ڈاگ" نے بھینس کی صاف کی ہوئی کھال پر

۱۸۰۰ء سے لیکر ۱۸۷۱ء تک کے واقعات کی یادداشت رکھی تھی۔ اُن میں سے چند مثالیں نیچے نقل کی جاتی ہیں۔ اب یہ کھال "امریکن میوزیم آف نیچرل ہسٹری" (نیویارک) میں محفوظ ہے۔

تیس ڈیکوٹا ہندی مارے گئے ۱۸۰۰ء

چیچک کی وبا پھیلی ۱۸۰۱ء

نعل بند گھوڑے چرائے ۱۸۰۲ء

کالی کھانسی کا زور ۱۸۱۳ء

سوکھی لکڑیوں سے گودام بنایا ۱۸۱۶ء

سردار کے گھوڑے مارے گئے ۱۸۲۴ء

سیلاب میں بہت سے ہندی غرقاب ہوئے ۱۸۲۵ء

گرڑا نامی ہندی بھالے سے مارا گیا ۱۸۴۰ء

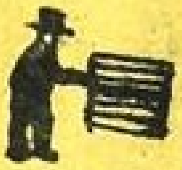
مسٹر جان رچرڈ سے کمبل خریدے ۱۸۵۳ء

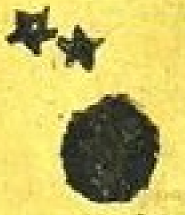
سورج گرہن پڑا جس میں ستارے نظر آئے ۱۸۶۹ء (۷ر اگست)

نیچے کی تصویر "وابوجیگ" نامی سردار کا سنگِ مزار ہے (جو سوپیریر جھیل کے نزدیک ۱۷۹۳ء میں مرا تھا) اُس کے قبیلے کا نشان رینڈیر (بارہ سنگھا) تھا جسے اُلٹا بنانے سے اُس کی موت مراد ہے۔ بارہ سنگھے کے نیچے کھنچی ہوئی لکیریں اُس کے زخموں کو ظاہر کرتی ہیں۔ اور دائیں بائیں طرف کی آڑی لکیریں اُن لڑائیوں کو جن میں وہ شریک ہوا تھا۔ بقیہ اشکال مطلب غیر واضح ہے۔

امریکن ہندی عموماً صاف کئے ہوئے چمڑے پر رنگوں سے لکھتے ہیں لیکن اُن میں سے بعض قبیلے بجائے لکھنے کے اُنھیں پوتوں سے سجاتے ہیں، جنھیں "ویم پم" کہتے ہیں۔ ان پوتوں کی بُنائی یا ٹکائی میں مختلف تصویریں بنائی جاتی ہیں جن سے خاص خاص مطلب مراد لئے جاتے ہیں۔ ایسی "پوت کی لکھائی" کا سب سے اچھا نمونہ وہ پیٹی ہے جسے لینی لینپ خاندان کے سرداروں نے ۱۶۸۲ء میں ولیم پین کو صلح کے موقع پر پیش کیا تھا۔ اُس میں ایک انگریز اور ایک ہندوستانی کو مصافحہ کرتے ہوئے دکھایا ہے (صلح کی علامت) اب یہ پیٹی "پنسلوانیہ ہسٹاریکل سوسائٹی" میں محفوظ ہے۔

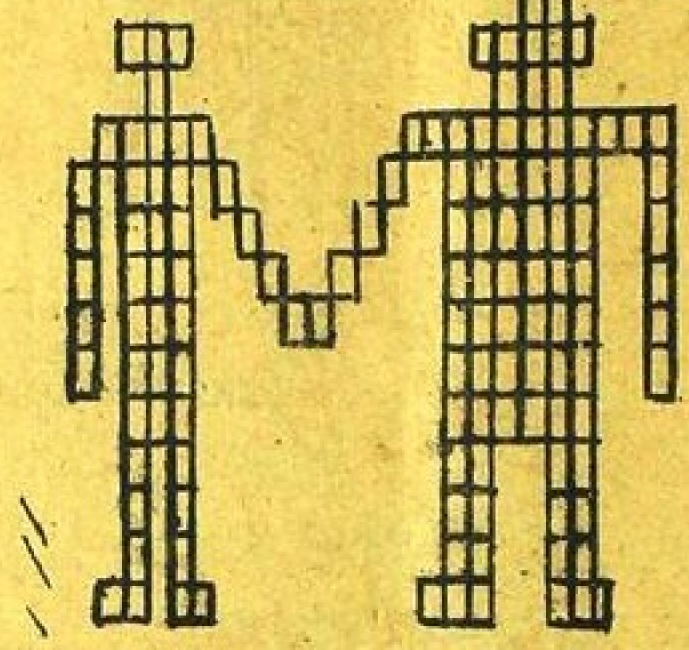

امریکن ہندیوں کی طرح الاسکا کے لوگ بھی تصاویر کے ذریعہ پیغام رسانی کرتے ہیں۔ عموماً یہ پیغامات لکڑی کی کھپاچوں پر نقش کرکے مکان کے سامنے آنے والوں کی اطلاع کے لئے رکھدئے جاتے ہیں۔ نیچے اس کی دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں :-

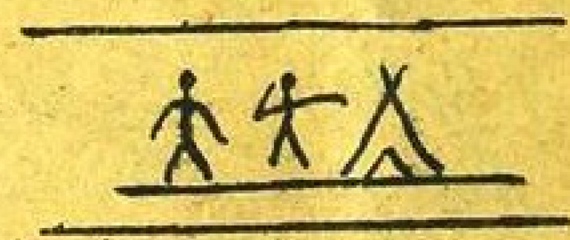

(دائیں سے بائیں کو) گھر میں ــــــ کچھ کھانے کو ــــــ نہیں ہے۔

(دائیں سے بائیں کو) میں اُس طرف جاؤں گا ــــ ناؤ کے ذریعہ (اور) ایک رات سوؤں گا ــــ جزیرے کے ایک جھونپڑے میں ــــ (پھر وہاں سے) میں جاؤں گا ــــ ایک (دوسرے) جزیرے میں ــــ (اور وہاں) دو راتیں سوؤں گا ــــ میں شکار کروں گا ــــ ایک بحری شیر ــــ تیر و کمان سے ــــ (پھر لوٹ آؤں گا) ناؤ سے ــــ اپنے گھر کو ــــ

سائبیریا میں بھی کسی حد تک تصویری رسم الخط کام میں لایا جاتا ہے۔ نیچے دی ہوئی مثال ایک محبت کی درد بھری داستان ہے :-

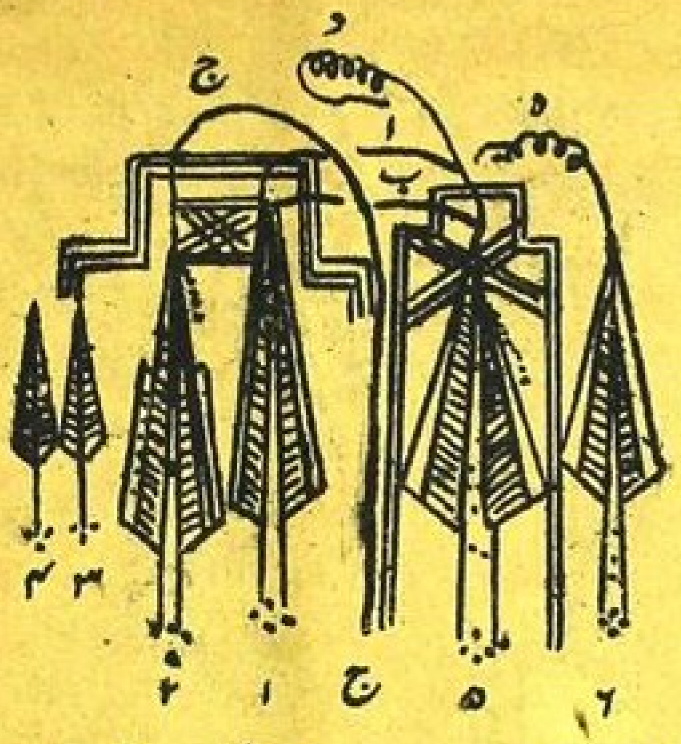

نمبر(۱) شوہر ہے اور نمبر(۲) اُس کی بیوی (سر کے پاس نقطوں سے مراد چوٹی ہے) نمبر ۳ اور ۴ اُس کے بچے ہیں لیکن وہ اس شادی سے خوش نہیں ہے (گھر کے درمیان صلیب ملاحظہ ہو) وہ ایک دوسری لڑکی (نمبر۵) کو چاہنے لگتا ہے (الف) اور وہ بھی اُسکی محبت میں مبتلا ہوجاتی ہے (ب) لیکن اُس مرد کی بیوی بیچ میں حائل ہوجاتی ہے اور رشتۂ محبت منقطع ہوجاتا ہے (ج) مگر پھر بھی وہ اُسے چاہے جاتی ہے (د) — یاد رہے عورت ایک بار محبت کرتی ہے بار بار نہیں — اگرچہ ایک دوسرا نوجوان (نمبر۶) اُسے چاہتا ہے (ہ) اس طرح اُس کی زندگی بے حد تلخ ہوجاتی ہے (گھر کے درمیان صلیب ملاحظہ ہو)

آخر میں افریقہ کے ایوتے زبان بولنے والے نیگرو لوگوں کے رسم الخط کا ذکر کروں گا جو اگرچہ شمالی امریکہ کے قدیم باشندوں کے رسم الخط کی طرح مکمل نہیں لیکن پھر بھی وہ کسی حد تک تصاویر کے ذریعہ خیالات کا اظہار کرلیتے ہیں۔ تصویری رسم الخط میں ان کی چند ضرب الامثال ملاحظہ ہوں:-

نمبر۱- "دو جنگجو ایک میدان میں نہیں رہ سکتے" نمبر۲- "سوئی بڑے بڑے کپڑے سیتی ہے" یعنی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے بڑے بڑے کام ہوتے ہیں۔ نمبر۳- "تاگا سوئی کے ساتھ چلتا ہے"۔ یعنی لڑکے باپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں۔

یوں تو دنیا کی بہت سی نیم مہذب اقوام تصویری رسم الخط کا استعمال کرتی ہیں لیکن میں اتنی ہی مثالوں پر اکتفا کروں گا کیونکہ میرا مقصد صرف یہ دکھانا تھا کہ تصویری رسم الخط سے کہاں تک خیالات کا اظہار کیا جاسکتا ہے۔ آیندہ اشاعت میں زمانۂ قدیم کی مہذب اقوام کے تصویری رسم الخط کا ذکر کروں گا۔ (باقی)

محمد اسحاق صدیقی

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوانِ شباب کا لکھا ہوا افسانہ جس کا ایک ایک جملہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات سے معمور ہے، یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ قیمت بارہ آنے علاوہ محصول۔

منیجر نگار

مومن کا تغزل

(بہ سلسلہ ماسبق)

مومن پر لکھنے والوں نے ان کی معنی بندی و مضمون یابی، دقیقہ سنجی و بلند پروازی، نازک خیالی و معنی آفرینی کی داد جن بلند آہنگ الفاظ میں دی ہے وہ پڑھنے والے کو مرعوب کردیتے ہیں لیکن اس باب میں انھوں نے جو مثالیں پیش کی ہیں اُن کو دیکھ کر ایک سوچنے سمجھنے والا دماغ یہ رائے قایم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ غزل سے متعلق اصطلاحات میں نازکخیالی اور مضمون آفرینی سے زیادہ خوش آہنگ مگر پُرفریب اور دھوکے باز اصطلاح شاید ہی کوئی اور ہو۔ اگر آپ سے کہا جائے کہ فلاں شاعر خرافات و مہملات کا بادشاہ ہے۔ اس کے کلام میں تخئیل کی بے اعتدالیاں اور گمراہیاں نقطۂ عروج پر نظر آتی ہیں تو مجھے یقین ہے کہ آپ اس کے کلام کو ذرا بھی لایقِ التفات نہیں سمجھیں گے لیکن اگر انھیں خصوصیات کو یوں بیان کر دیا جائے کہ وہ شاعر نازک خیالی اور معنی آفرینی میں اپنا جواب نہیں رکھتا تو آپ نہ صرف اس کے کلام کے متعلق بلند رائے قایم کرلیں گے بلکہ اس کے سامنے سرِ عقیدت بھی خم کردیں گے حالانکہ یہ دونوں باتیں نفسِ حقیقت کے اعتبار سے ایک ہی ہیں۔ ثبوت کے لئے مومن کی نازک خیالی اور معنی آفرینی کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔ اس ضمن میں میں صرف وہی اشعار پیش کرونگا جو مومن پرست قسم کے ارباب قلم نے پیش کئے ہیں تاکہ آپ یہ نہ کہ سکیں کہ میں نے مثالوں کے انتخاب میں نیک نیتی سے کام نہیں لیا۔ سب سے پہلے پروفیسر ضیاء کی منتخب کردہ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

کرۂ خاک ہے گردش میں تپش سے میری
میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں بھی آزاد رہا

اس شعر کے معنی بھی موصوف ہی کے الفاظ میں سُن لیجئے۔ لکھتے ہیں:۔ "مجھے حالتِ اسیری میں بھی آزادی میسر ہے۔ اس واسطے کہ جب میں زنداں میں تڑپتا ہوں تو میری تپش کے اثر سے تمام کرۂ زمین گردش کرنے لگتا ہے اور اس کے ساتھ میں بھی گردش کرنے لگتا ہوں۔ اب آزادی کے لئے اور کیا چاہئے؟"

اگر قدرت نے آپ کو فہم عامہ کا تھوڑا سا بھی حصہ عطا کیا ہے تو غور فرمایئے کہ اس شعر میں کون سی بات ایسی ہے جسکی بنا پر اس کو مہمل نہ کہا جاسکے۔ دعویٰ یہ ہے کہ میں زنداں میں آزاد رہا۔ دلیل یہ ہے کہ جب میں تڑپتا ہوں تو میری تپش کے اثر سے تمام کرۂ زمین گردش کرنے لگتا ہے اور اس کے ساتھ میں بھی گردش کرنے لگتا ہوں۔ یعنی ایک لغو دعوے کو لغو تر دلیل سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اسی کا نام ہے نازک خیالی و معنی آفرینی۔ غالباً ایسے ہی موقع کے لئے کہا گیا ہے،

برعکس نہند نام زنگی کافور۔

یادش بخیر۔ جناب اثر لکھنوی نے اِس شعر کو ایک اور نقطۂ نظر سے سراہا ہے لکھتے ہیں:۔ شعر نہیں ایک کارنامہ ہے۔ پہلا مصرع بندش اور بلاغت کے لحاظ سے اپنا جواب نہیں رکھتا۔ ایک تو اس زمانہ میں جب کہ دنیائے شاعری گردشِ فلکی کی قایل تھی (میں یہ نہیں کہتا کہ گردش ارضی سے واقف نہیں تھی)

"کرۂ خاک ہے گردش میں تپش سے میری"

کہنا اختراع فایقہ ہے۔ مجھے علم نہیں ممکن ہے کہ اوروں نے بھی کہا ہو مگر تپشِ عشق کو گردشِ ارضی کا سبب قرار دینا شاعری

کی وہ منزلیں ہیں جن کے خیال سے بڑے بڑوں کے حوصلے پست ہوگئے ہوں گے۔" قربان جایئے اس نکتہ سنجی و سخن فہمی کے جسکی بدولت ایک لایعنی شعر ایک کارنامہ اور اختراعِ فائقہ کے مرتبے کو پہونچ گیا۔ خواجہ حافظ نے حسرت آگیں لہجے میں پوچھا تھا:۔

آنانکہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند ۔ آیا بود کہ گوشۂ چشمے بہ ما کنند؟

معلوم نہیں کہ ان کی تمنا پوری ہوسکی یا نہیں لیکن مومن کے بارے میں شک نہیں کہ ان کو اس دور میں ایک ایسا اہلِ نظر مل ہی گیا جس کی توجہ نے اُن کی "خاک" کو "کیمیا" بنانے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ کاش آثر صاحب سمجھ سکتے کہ مومن کا مندرجۂ بالا شعر یا اسی قسم کے اور اشعار کہنے کے لئے حوصلے کی بلندی قطعی ضروری نہیں صرف "ذوق فضول" کا ہونا کافی ہے۔

مومن ؎ دیکھ اپنا حالِ زار منجم ہوا رقیب ۔ تھا سازگار طالعِ ناساز دیکھنا

پروفیسر ضیاء کے الفاظ میں اس کے معنی یہ ہیں:۔ "منجم نے شاعر کا حالِ زار دیکھا اور تاثیرِ نجوم کے حساب سے اس کی ناکامیِ عشق کا پتہ لگا لیا اور خود اس کا رقیب بن بیٹھا کیونکہ عاشق کی ناکامی دریافت کرکے اس کو اپنی کامرانی کی توقعات پیدا ہوئیں۔ اس طرح اس کا طالعِ ناساز دیکھنا منجم کے حق میں سازگار ہوا۔"

دُنیا صدیوں سے اس غلط فہمی میں مبتلا تھی کہ محبت ایک قسم کا جذبۂ بے اختیار ہے اس ضمن میں مومن کی تحقیق کچھ اور نکلی۔ چنانچہ انھوں نے دنیا کی صدیوں پُرانی غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے مندرجۂ بالا شعر تصنیف کیا اور بتایا کہ عشق کسی خود رو جذبے کا نام نہیں۔ اس میں مصلحت نوازی، دور اندیشی اور عاقبت بینی کو اتنا ہی دخل ہے جتنا کہ سیاست اور تجارت میں۔ جب تک کسی کو اس بات کی قوی امید نہ ہو کہ وہ فلاں سے عشق کرنے میں کامیاب ہوگا اس وقت تک وہ اس کام میں ہاتھ ہی نہیں لگاتا۔ اور جس طرح ایک بنیا تجارت میں صحیح Speculation کی مدد سے نسبتاً زیادہ منافع حاصل کرسکتا ہے اسی طرح ایک منجم عشق کے معاملے میں اپنے علمِ نجوم سے نسبتاً زیادہ فایدہ اُٹھا سکتا ہے۔ غالباً اسی قسم کے انکشافات جدیدہ کا نام نازک خیالی اور معنی آفرینی ہے۔

مومن ؎ پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے ۔ اس کا نہ دیکھنا نگہِ التفات ہے

پروفیسر ضیاء کی تشریح:۔ "محبوب کا میری طرف نہ دیکھنا بھی نگہِ التفات کا حکم رکھتا ہے کیونکہ اگر وہ اِدھر دیکھتا تو میرا قرار و ثبات پامال ہوجاتا۔"

اس عالمِ آب و گل میں جب کوئی انسان کسی سے محبت کرتا ہے تو اس وقت تک بے قرار اور مضطرب رہتا ہے جب تک محبوب اس کی طرف ملتفت نہیں ہوتا۔ عاشق کی طرف محبوب کا التفات اس کی بے قراری اور بے چینی میں تسکین کا باعث ہوتا ہے نہ کہ اس کا رہا سہا صبر و قرار بھی پامال ہوجاتا ہے لیکن مومن کا تجربہ ٹھیک اس کے برعکس ہے۔ اور کیوں نہ ہو بقول مومن ؏ "ہم اُلٹے، بات اُلٹی یار اُلٹا" یار اُلٹا ہو یا نہ ہو لیکن باقی دو کا اُلٹا ہونا یقینی ہے۔

مومن:۔ بیزار جان سے جو نہ ہوتے تو مانگتے ۔ شاہد شکایتوں پہ تری مدعی سے ہم

"مدعی (رقیب) نے معشوق سے کہا کہ عاشق (مومن) تمھاری شکایتیں کرتا پھرتا ہے اس پر معشوق آمادۂ قتل ہوگیا۔ عاشق کہتا ہے کہ مدعی کا الزام جھوٹا ہے اور اگر میں خود جان سے بیزار نہ ہوتا تو اس ناکردہ جرم کے مواخذہ سے بچنے کے لئے اس سے ضرور گواہ طلب کرتا۔ لیکن میں تو خود مشتاقِ قتل ہوں۔"

آپ خود فیصلہ کرلیں کہ یہ مضمون تخئیل کی نزاکت ہے یا خرافیت؟ معنی آفرینی ہے یا مہمل طرازی؟

مومن ؎ عدو اس اوج پر شاکی ہے شاید غصہ آجائے ۔ ملادے خاک میں یہ تو بھی شکرِ آسماں کیجے

پروفیسر ضیاء کی تشریح:۔ "اگر آسماں مجھے خاک میں بھی ملادے تو بھی مجھے چاہئے کہ اس کے ظلم پر شکر کرتا رہوں۔

نتیجہ یہ ہوگا کہ اُس (آسمان) کی عادت بگڑ جائے گی۔ اور وہ اس شکر کو اپنا حق سمجھنے لگے گا۔ ادھر رقیب کا یہ حال ہے کہ اس اوج کے باوجود آسمان کی شکایت کرتا رہتا ہے اور بالآخر کسی دن آسمان شکایت پر بگڑ کر اس کو نیچا دکھائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ آسمان تو مجھ ستم زدہ کی شکر گزاری کا خوگر ہوگا۔ رقیب کی شکوہ سنجی (اوج کے باوجود) اس کو برہم کردے گی۔"

اگر کوئی عاشق اس قسم کے خیالات کا اظہار اپنے کسی رازدار یا غمگسار سے بھی کرے تو مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی تمام تر ہمدردیوں کے باوجود اس قسم کی باتوں کو معاف نہ کرسکے گا اور بے اختیار کہہ اٹھے گا۔ "یہ کیا بکواس ہے؟" لیکن جب کوئی شاعر اسی بکواس کو دو مصرعوں کی شکل میں پیش کردیتا ہے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے ارباب نقد و نظر تک اس بکواس کو نازک خیالی اور معنی آفرینی سے کیوں تعبیر کرنے لگتے ہیں۔

پروفیسر ضیاؔ نے اپنے مرتب کردہ "دیوان مومنؔ" کے مقدمے میں نازک خیالی اور معنی آفرینی کے عنوان کے تحت اور بھی کوئی اشعار پیش کئے ہیں، جن سے بخوف طوالت میں صرف نظر کئے لیتا ہوں اور بعض دوسرے ارباب قلم کی پیش کردہ مثالوں سے بحث کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہوں تاکہ یہ بات واضح ہوجائے کہ مومنؔ کے لایعنی اشعار پر نازک خیالی اور معنی آفرینی کا دھوکا صرف پروفیسر ضیاؔ ہی کو نہیں ہوا بلکہ دوسروں کو بھی۔

مومنؔ کے پرستاروں میں ایک صاحب ہیں معجزؔ سہسوانی۔ انھوں نے "مومنؔ و غالبؔ" کے نام سے ایک چھوٹی سی کتاب لکھی ہے۔ جس میں نازک خیالی اور معنی آفرینی کے اعتبار سے مومنؔ و غالبؔ کا موازنہ کرکے مومنؔ کو غالبؔ سے برتر شاعر ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہاں اس موازنہ سے کوئی بحث نہیں۔ میں اس میں سے مومنؔ کے صرف دو تین ایسے اشعار لیتا ہوں جن کی نزاکتِ تخئیل اور معنی آفرینی پر جناب معجزؔ لوٹ ہیں۔

مومنؔ ؎ دیکھا ادھر کو تو نے کہ بس دم نکل گیا — اترے نظر سے اپنی نگہبانیوں میں ہم

جناب معجزؔ لکھتے ہیں:۔ "یعنی[1] معشوق کا کسی طرف دیکھنا ہم کو گوارا نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اپنی جانب بھی اور جس کی طرف وہ دیکھتا وہی ہم کو اپنا دشمن نظر آتا ہے۔ اس وجہ سے جب اس نے ہماری جانب دیکھا تو ہم خود اپنی نظر سے اُتر گئے یہ ہماری نگہبانی کا نتیجہ نکلا۔ اس تخئیل کی نزاکت قابلِ تحسین ہے۔"

عام قاعدہ تو یہی ہے کہ جذبۂ رشک کی بنا پر عاشق کو محبوب کا کسی اور کی طرف دیکھنا گوارا نہیں ہوتا لیکن مومنؔ جو عشق کے معاملے میں بھی "صاحبِ طرز" واقع ہوئے تھے انھیں یہ بھی گوارا نہ تھا کہ محبوب خود ان کی طرف دیکھے۔ بدقسمتی یا سوءِ اتفاق سے ایک مرتبہ ان پر محبوب کی نگاہ پڑ ہی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اور رقیبوں کی طرح مومنؔ خود بھی اپنی نظر سے اُتر گئے۔ خیر، یہ تو جو ہونا تھا سو ہوا۔ زندگی میں بے تکے واقعات بھی وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ جب مومنؔ نے اس بے تکے واقعہ کو نظم کردیا تو اس میں تخئیل کی نزاکت کہاں سے پیدا ہوگئی۔

مومنؔ ؎ دعا بلا تھی شبِ غم سکونِ جاں کے لئے — سخن بہانہ ہوا مرگ ناگہاں کے لئے

جناب معجزؔ لکھتے ہیں:۔ "مومنؔ خاں کا (یہ) شعر دقیق و کثیر المعنی ہے۔ یعنی ہم نے شبِ غم سکونِ جاں کے لئے جو دعا مانگی وہ مرگ ناگہاں کے لئے بہانہ ہوگئی اور اس نے آکر قصہ فیصل کردیا۔ یا یہ کہ دعا مانگنے میں ضعف سے روح پرواز کرگئی اور یہ پہلو بھی درست ہے کہ موت خود ہی آنے والی تھی دُعا کا ایک بہانہ ہوگیا۔ حاصل تمام معانی کا ایک ہے۔ اس بلاغت کا جواب نہیں ہوسکتا۔"

---

[1] پروفیسر ضیاؔ کی تشریح معجزؔ صاحب کے بیان کردہ مطلب سے مختلف ہے۔ لیکن ان دونوں کے درمیان تصفیہ کرانا میرا کام نہیں۔

یوں تو اس شعر میں بے مزہ بلکہ بدمزہ مبالغے کے سوا کچھ بھی نہیں لیکن اگر کوئی شخص جناب متجز کی سی بصارت و بصیرت کا مالک ہو تو وہ اس میں خیال کی دقت، معنی کی کثرت، طرزِ ادا کی بلاغت غرض کیا کچھ نہیں دیکھ سکتا؟

اب مومن کے دو ایک ایسے شعر ملاحظہ ہوں جن کی نازک خیالی اور معنی آفرینی نے جناب آسی لکھنوی سے خراجِ تحسین وصول کیا ہے۔

مومن ؎ تیری جفا ہو تو ہے سب دشمنوں سے امن بدمست غیر، محو دل، اور بخت خواب میں

جناب آسی لکھتے ہیں:- "۔۔۔۔ غیر اس وقت شرابِ عیش سے بدمست ہے۔ میرا دل محو ہو کر رہ گیا ہے میرا نصیب محو خواب ہے۔ اگر ایسے میں تو بھی جفا سے باز آجائے تو مجھے تمام دشمنوں سے نجات مل جائے۔ تغزل کی حد میں ایسی مضمون آفرینی اور اسی کے ساتھ بیان میں شگفتگی مومن ہی کا حصہ تھا"

یہ شعر مومن کی زندگی کے ایک خاص لمحے کی یادگار ہے۔ حسن اتفاق سے اس وقت رقیب شراب پی کر بدمست ہوگیا تھا اور مومن کو اس کی ستم رائیوں سے نجات مل گئی تھی۔ اِدھر ان کی پُرآشوب قسمت (زیر بحث شعر کا ایک اہم نقص یہ ہے کہ "بخت خواب میں" کا مفہوم وہ نہیں جو مومن کا مقصود ہے۔ بخت کا خواب میں ہونا بدبختی کی علامت ہے نہ کہ خوش نصیبی کی) بھی سو رہی تھی۔ صرف محبوب کے مظالم کی مشین بدستور چل رہی تھی اور اگرچہ اُس وقت مومن کا دل بھی محو ہو کر رہ گیا تھا پھر بھی مومن کو تکلیف ہو رہی تھی کیونکہ محبوب کے مظالم دل کی بجائے ان کے اعصاب پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ چنانچہ انھوں نے بیتاب ہو کر فرمایا ؎

تری جفا نہ ہو تو ہے سب دشمنوں سے امن بدمست غیر، محو دل، اور بخت خواب میں

اب ایک آخری مثال پیش کرتا ہوں جو مومن کے ایک نقاد سید امتیاز احمد کا انتخاب ہے۔

مومن ؎ لذتِ مرگ سے ہجراں میں دعا ہے کہ خدا یہ مزا ہو نہ نصیبوں میں کسی بے حس کے

امتیاز صاحب لکھتے ہیں:- "بے حس لذتِ مرگ سے کیا خاک لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ اسے مومن ہی کے لئے مخصوص ہونا چاہئے۔ نیش کو نوش بنانا شاعر کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ مومن کی تخئیل کو دیکھئے۔ کہتا ہے ظاہر ہے کہ عدو کو نہ کبھی ہجر کی مصیبت اُٹھانا پڑے گی نہ اس کے صدموں سے کبھی مرنا ہوگا۔ یہ شرف تو صرف عاشق صادق کی قسمت میں لکھا ہے جب یہی ہونا ہے تو کیوں نہ مرگ کو شربت بنا کر اس طرح پیو کہ ایک بار تو رقیب کو بھی رشک ہو جائے۔ یہ مومن کی وہ پروازِ تخئیل ہے جس کے متعلق غلام ربانی عزیز کا خیال ہے کہ ان بلندیوں پر غالب ایسے سدرہ نشین کے پر جلنے لگتے ہیں"

امتیاز صاحب کا یہ کہنا صحیح ہے کہ "نیش کو نوش بنانا شاعر کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے" لیکن یہ بھی غلط نہیں کہ شاعر جب بائیں ہاتھ کا کھیل دکھانے پر اتراتا ہے یا تخئیل کے زور سے آسمان پر چڑھنے لگتا ہے اُس وقت وہ اور جو کچھ بھی رہے شاعر باقی نہیں رہتا اور اس عالم میں جو کچھ کہتا ہے اسے شعر کہنا بھی ایک وجدانی جرم ہے۔

یہ صحیح ہے کہ نازک خیالی اور مضمون آفرینی کی آڑ میں "اناپ شناپ فرمانے" کے گنہگار تنہا مومن نہیں ہیں۔ در اصل یہ ایک مستقل روایت ہے جو اُردو شاعری کو فارسی شاعری سے بطور وراثت ملی۔ اس غیر صحت مند روایت سے فارسی و اُردو شاعری میں بڑے بڑوں کے دامن داغ دار ہیں۔ یہ دونوں زبانوں کی انتہائی بدنصیبی تھی کہ انکے اساتذۂ سخن اس مضر روایت کے شکار ہو گئے۔ لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس روایت کے نتائج کو تعریف و تحسین کا مستحق ٹھہرا کر اور ان کو اپنے اساتذۂ سخن کا سب سے بڑا کمال قرار دے کر دوسری غلطی ہم کیوں کریں؟

آپ مومن کی نازک خیالی اور معنی آفرینی کی چند مثالیں دیکھ چکے۔ ان کے دیوان میں اسی قسم کے اشعار کی

کثرت ہے - اس کے باوجود مومن کے بعض پرستاروں مثلاً جناب متعجز کا دعویٰ ہے کہ مومن کا "ہر شعر دقیق معنی اور لطیف احساس کا ایک طلسم ہے" اور پروفیسر ضیاء کے نزدیک مومن حسن تخئیل کے اعتبار سے یوسف مصر معانی کہے جانے کے مستحق ہیں"
لیکن جب دور حاضر کا ذوق شعری مومن کے ان اشعار کو صحیح شاعری کے دائرے سے خارج قرار دیتا ہے تو مومن کے پرستار بعض ادبی نظریات کے دامن میں پناہ لینے کی کوشش کرتے ہیں - مثلاً جب پروفیسر کلیم الدین احمد نے مومن پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا کہ " مومن کی نازک خیالی اور بدیع الاسلوبی مسلم - مگر یہ صحیح شاعری نہیں، کیونکہ اول الذکر تاثیر سے مجبور ہے اور آخر الذکر تصنع سے معمور" تو پروفیسر ضیاء نے جواب میں دو ادبی نظریات کا سہارا لیتے ہوئے فرمایا :-

"جب ہم اچھے شعر کے لئے صداقت کی شرط لگاتے ہیں تو ہمارا مقصود سادہ اور سپاٹ حقیقت کا اظہار نہیں ہوتا ورنہ دندان تو جملہ در دہانند ، چشمان تو زیر ابرو آنند، کو بھی شعر ماننا پڑے گا - بات یہ ہے کہ شعری حقیقت اور سائنٹفک حقیقت میں آسمان و زمین کا فرق ہے - شعر میں حقیقت اس زاویے سے بیان کی جاتی ہے جس سے شاعر کا ذہن اسے محسوس کرتا ہے اس کے برخلاف سائنس کا نصب العین حقیقت نفس الامری کا اظہار ہے، ایک کا نقطۂ نظر موضوعی، داخلی اور جذباتی ہے دوسرے کا معروضی، خارجی اور عقلی - ایک تخلیق حسن کا ضامن ہے - دوسرا اضافۂ معلومات کا : - - - -"

" اولاً ان (مومن) کے خیالات کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ہر خیال حسب معمول جذبات اور تخئیل کے امتزاج کا نتیجہ ہے - دوسرے الفاظ میں انھوں نے وارداتِ محبت کی جو ترجمانی کی ہے اس کا تعلق جذبات سے ہے جن میں ان کی تخئیل نے اپنا رنگ بھر دیا ہے - یا یوں کہئے اپنے جذباتی تجربات کو انھوں نے اپنی تخئیل کی رنگین عینک سے دیکھا ہے - جذبات کی اصلیت و صداقت کی بحث اوپر گزری - رہی تخئیل - یہ در اصل قوت اختراع کا نام ہے جس کے بغیر شعر شعر نہیں کہلاتا"
شاعرانہ حقیقت اور حکیمانہ حقیقت کا فرق مسلم - لیکن اس بحث سے کلیم صاحب کے اعتراض کی تردید ممکن نہیں - اگر ایک طرف دندان تو جملہ در دہانند، چشماں تو زیر ابرو آنند والی حقیقت کسی شعر کا موضوع نہیں بن سکتی تو دوسری طرف ان حقائق پر بھی شاعری کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی جو (مثال کے طور پر) مومن کے ان اشعار میں پائے جاتے ہیں :-

کرۂ خاک ہے گردش میں تپش سے میری — میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں بھی آزاد رہا
دعا بلا تھی شب غم سکون جاں کے لئے — سخن بہانہ ہوا مرگ ناگہاں کے لئے

یہ اشعار جہاں سائنٹفک حقیقت سے خالی ہیں وہاں شاعرانہ حقیقت سے بھی بیگانہ ہیں - رہا یہ نظریہ کہ تخئیل کے بغیر شعر شعر نہیں کہلاتا سو وہ بھی درست ہے لیکن انھیں یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ "جہاں تخئیل شعر کی روح رواں ہے وہاں اس کی بے راہ روی اور بے اعتدالی شعر کی موت بھی ہے" اور مومن کے کلام میں تخئیل کی بے اعتدالیاں کثرت سے پائی جاتی ہیں - پروفیسر ضیاء کا یہ زیر لب اعتراف کہ " مومن کے یہاں تخئیل کے اعتدال کے ساتھ اس کی بے اعتدالی کی مثالیں بھی ملتی ہیں خصوصاً ابتدائی دور میں جب کہ وہ رنگ ناسخ کے پیرو تھے" یا ایک جگہ یہ کہنا کہ " مومن کے یہاں خصوصاً ابتدائی کلام میں (جب کہ وہ رنگ ناسخ کی طرف مائل تھے) اور کہیں کہیں بعد میں شاید عام مذاق کے اثر سے رسمی اور غیر حقیقی جذبات کا سراغ بھی ملتا ہے - لیکن یہ ان کا اصلی رنگ نہیں" در اصل کلام مومن کے ایک نمایاں عیب پر پردہ ڈالنے کے برابر ہے -
چونکہ مومن کی نازک خیالی اور مضمون آفرینی سے متعلق زیادہ تر اشعار غیر فطری اور مبالغہ آمیز ہیں اس لئے مومن کے ایک پرستار سید امتیاز صاحب نے ان کی شاعری کو متذکرہ نقص سے بری ثابت کرنے کے لئے ایک عجیب منطق پیش کی ہے فرماتے ہیں "اردو شاعری کو مبالغہ آمیز کہہ کر جو ٹال دیا جاتا ہے وہ درحقیقت کوئی معنی نہیں رکھتا - اگر ایک شاعر کی حس بڑھی ہوئی ہے اور اس کا بیان ہمارے محسوسات کی رو سے مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے تو یہ ضروری نہیں کہ وہ مبالغہ آمیز ہی ہو

مثلاً مومن کہتا ہے :-

تیرے دل تفتہ کی تربت پہ عدو جھوٹا ہے　　گل نہ ہوں گے شررِ آتشِ سوزاں ہوں گے

پہلی نظر میں یہ شعر صاف مبالغہ معلوم ہوتا ہے اور ہے - مگر اس کا کیا علاج کہ مومن کسی طور پر یہ محسوس ہی نہیں کرسکتا کہ تیرے دل تفتہ کی تربت پر گل ہوں گے اگر ہوں گے تو شررِ آتشِ سوزاں ہی ہوں گے - اس بڑھی ہوئی حس کے سامنے مبالغہ آمیز کہنے والوں اور عدو کے بیان کی کیا وقعت باقی رہ سکتی ہے - انداز بیان نے اس غیر فطری بیان میں تاثیر پیدا کردی"

امتیاز صاحب کی مندرجہ بالا سطریں ان کے دعوے کو تو ثابت نہ کرسکیں لیکن ان سے اس امر کا پتہ ضرور چلتا ہے کہ ایک پڑھا لکھا آدمی بھی اگر ذوقِ سلیم سے محروم ہو تو کس درجہ لغو گفتگو کرسکتا ہے - انھوں نے مومن کا جو شعر پیش کیا ہے اس کی تاثیر کو محسوس کرنا ان ہی کے دل گداختہ کے بس کی بات تھی - پھولوں کی شررِ آتشِ سوزاں کہنا مبالغہ نہ سہی شاعر کی بڑھی ہوئی حس کا نتیجہ سہی لیکن کیا قبر کے اندر سے عدو کے بیان کی تردید بھی جناب عاشق یا جناب شاعر کی بڑھی ہوئی حس ہی کا نتیجہ ہے ؟ - اس میں شک نہیں کہ ایک عام آدمی کی بہ نسبت ایک شاعر کے احساسات زیادہ مشتعل اور تیز ہوتے ہیں مگر اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ جو چیز ایک عام آدمی کو رائی کے برابر نظر آتی ہے وہ شاعر کو پہاڑ کی ہمسر نظر آئے - اگر ایسا ہوتا تو ایک عام شخص شاعروں کے کلام میں اپنے جذبات و محسوسات کا عکس دیکھنے سے قاصر رہتا - شاعر کی قوتِ حس کے زیادہ تیز ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ جن کیفیات و جذبات کو ایک عام انسان مبہم طور پر اپنے دل میں محسوس کرتا ہے ، ایک شاعر ان کو وضاحت اور شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے اور بس - جب میر یہ کہتے ہیں ؎

میرے مرنے کی حقیقت جس میں تھی　　ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا

یا جب مومن یہ کہتے ہیں :-

مہتاب کا کیا رنگ کیا دور فغاں نے　　احوال شب تار سے روشن ہے ہمارا
جا بجا نہریں ہیں جاری میں نے اشک　　پونچھے ہوں گے دامنِ کہسار سے
کیوں کر نجات آتش ہجراں سے ہو کہ مرگ　　آئی تو دور ہی تب و تاب بدن سے ہے
ہوگئی ساری زمیں صرف حروفِ نو رقم　　اک جہاں ویران ہے میرے نامہ کی تحریر سے
سیکھے ہیں مجھ سے نالۂ نہ آسماں شکن　　صیاد اب قفس میں عنادل کو تھامنا

تو وہ اپنی بڑھی ہوئی حس کا ثبوت نہیں دیتے بلکہ مضحکہ خیز قسم کی مبالغہ آرائی میں اپنے کمال کا اظہار کررہے ہوتے ہیں یہ ایک سیدھی سی بات ہے جس کو منطقی ہتھیروں سے غلط ثابت کرنے کی کوشش بے سود ہے -

اوپر کی سطروں میں میں نے مومن کی نازک خیالی اور معنی آفرینی کے متعلق جو خیالات ظاہر کئے ہیں ان کا ماحصل یہ ہے کہ جن اشعار میں بے تکی خیال آرائیاں ہوں ، بے بات کی بات (بات سے بات پیدا کرنا حسن ہے) پیدا کی گئی ہو دوراز کار مبالغے سے کام لیا گیا ہو ، کسی لغو دعوے کو لغو تر دلیل سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہو ان پہ نازک خیالی اور مضمون آفرینی کا لیبل نہیں لگانا چاہئے - ان اصطلاحات کا اطلاق ان اشعار پر ہونا چاہئے جو حسن تعبیر ، حسن توجیہ ، حسن تمثیل سے عبارت ہوں جو خیال کی نزاکتوں پر مبنی ہونے کے باوجود ذہنی ورزش کے نتائج نہ ہوں ، جن میں کوئی ایسی بات کہی گئی ہو جو حیرت انگیز ہونے کے باوجود غیر فطری نہ ہو ، جو انوکھی ہونے کے باوصف ہر شخص کو اپنے دل کی بات محسوس ہو اور دل کی بات محسوس ہوتے ہوئے بھی انوکھی نظر آئے - مثال کے طور پر غالب کے اس شعر کو لیجئے ؎

شنیدہ کہ بہ آتش نہ سوخت ابراہیم　　ببیں کہ بے شرر و شعلہ می توانم سوخت

اس میں تخیل کی نزاکت، فکر کی بداعت، اور نکتہ آفرینی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ روایت کی رو سے پہلے مصرعہ کی واقعیت میں کوئی شک ہی نہیں۔ دوسرا مصرعہ بڑا چونکانے والا ہے پھر بھی اصلیت سے بیگانہ نہیں۔ انسان شعلہ و شرر کے بغیر بھی جلتا ہے۔ جذبات و محسوسات میں بھی سوز و تپش کی کیفیت ہوتی ہے۔ یہ ہر شخص کے تجربہ کی بات ہے لیکن غالب نے اس آفاقی تجربے کو اپنے انداز بیان سے ایک انوکھی چیز بنا دیا ہے۔

تعبیرات و تمثیلات کی شاعری میں نازک خیالی اور مضمون آفرینی کے بڑے پاکیزہ نمونے ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر غالب کے دو فارسی شعر ملاحظہ ہوں ؎

نازم فروغ بادہ ز عکس جمال دوست گوئی فشردہ اند بجام آفتاب را

سرگرمیِ خیال تو از نالہ باز داشت دل پارہ آتشےست کہ دودش نماندہ است

پہلے شعر میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ روئے محبوب کے عکس سے شراب کی تابش ایسی معلوم ہوتی ہے گویا پیالے میں آفتاب نچوڑ کر رکھ دیا گیا ہے۔

دوسرے شعر کا مفہوم یہ ہے کہ تیرے خیال کی محویت نے مجھے نالہ و فغاں سے باز رکھا۔ گویا دل آگ کا ایک ٹکڑا ہے جس سے دھواں نہیں نکلتا۔

سچ پوچھئے تو نازک خیالی اور معنی آفرینی کے الفاظ ان ہی اشعار پر سجتے ہیں۔ اس قسم کے اشعار کے لئے متذکرہ اصطلاحات استعمال کرتے وقت محسوس ہوتا ہے کہ یہ اصطلاحات لفظی حیثیت سے جس قدر حسین اور خوش آہنگ ہیں معنوی اعتبار سے بھی اتنی ہی لطیف و دلکش ہیں۔

نازک خیالی اور مضمون آفرینی کی ایک اچھی مثال غالب کا یہ اُردو شعر بھی ہے ؎

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اُٹھتی ہے صدا ہر کوئی درماندگی میں نالہ سے ناچار ہے

ایک معقول دعوے کے لئے ایک شاعرانہ دلیل پیش کی گئی ہے لیکن وہ بھی معقولیت سے خالی نہیں۔

نازک خیالی اور معنی آفرینی کی اور بھی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ غالب کا ایک شعر ہے:۔

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد

ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

یہاں دوسرے مصرعہ میں صرف ایک لفظ "صد" کے استعمال نے شعر کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔ اسے کہتے ہیں تخئیل کی نزاکت اور نکتہ آفرینی۔ غالب ہی کا ایک اور شعر یاد آیا ؎

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے

کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

نازک خیالی اور معنی آفرینی کا کتنا دلکش مرقع ہے! اس میں تخئیل کی جو لطافتیں پوشیدہ ہیں وہ تشریح کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔

یہاں غالب کے اشعار پیش کرنے سے میرا مقصود غالب اور مومن کا موازنہ نہیں بلکہ نازک خیالی اور معنی آفرینی کے صحیح مفہوم کی وضاحت کرنی ہے۔ مومن کے کلام میں ایسے اشعار جو نازک خیالی اور معنی آفرینی کے صحیح معیار پر پورے اُترتے ہوں نایاب نہیں لیکن کمیاب ضرور ہیں اور جو کچھ ہیں ان کو مومن کے پرستاروں نے لائقِ التفات نہیں سمجھا۔ یہاں میں صرف دو تین مثالیں پیش کرنے پر

اکتفا کرتا ہوں ؎

ناصح کہاں تلک تری باتیں اُٹھا سکوں — سچ ہے کہ مجھ میں طاقت جور و ستم نہیں
شبنم خراب جہر و کتاں سینہ چاک ماہ — لو اور بھی ستم زدۂ روزگار ہیں
دونوں کا ایک حال ہے یہ مدعا کا ہوش — وہ ہی خط اس نے بھیج دیا کیوں جواب میں

(باقی)

نظیر صدیقی

(نگار) جناب نظیر صدیقی کے "تبصرۂ کلام مومن" کے متعلق ہم اپنی رائے اُس وقت پیش کریں گے جب یہ مقالہ تمام و کمال شایع ہو جائے گا۔

"نگار" کا آیندہ سالنامہ

(فرمانروایانِ اسلام نمبر)

دراصل "تاریخ اسلامی" کا نچوڑ ہوگا، جس میں ولادتِ رسول اللہ سے لیکر اس وقت تک کی تمام چھوٹی بڑی مُسلم حکومتوں کا ذکر ہوگا جو ۱۳ سو سال کے اندر تمام کرۂ ارض پر رونما ہوکر فنا ہوگئیں یا اب بھی باقی ہیں۔ اس میں ان تمام حکومتوں کے اسباب قیام و عروج اور انحطاط و اختتام کے ذکر کے ساتھ، تمام حکمرانوں کے نام، ان کی حکومت کی مدت بقید سن ہجری و عیسوی درج ہوگی اور یہ بتایا جائے گا کہ ایک ہی خاندان سے اور کتنے خاندان پیدا ہوئے، انھوں نے کہاں کہاں حکومتیں کیں اور ان کا کیا حشر ہوا

مسلمان اپنے زمانۂ عروج میں یوروپ، ایشیا، افریقہ کے ان بعید ترین گوشوں تک پہونچ گئے تھے جن کا آج تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، لیکن اس کا علم بہت کم حضرات کو ہے۔ نگار کے اس سالنامہ کے ذریعہ سے تاریخ اسلام کی انھیں مفید و دلچسپ معلومات کو پیش کیا جائے گا۔ اس کے ساتھ دو نقشے ایسے پیش کئے جائیں گے جن کو دیکھ کر مسلمانوں کے عروج و زوال کی تصویر آپ کے سامنے آجائے گی

یہ پورا سالنامہ خود اڈیٹر نگار مرتب کر رہے ہیں اور امید ہے کہ ہم پہلی جنوری ۱۹۵۴ء تک اسے شایع کرسکیں گے اس کی ضخامت کا صحیح اندازہ ابھی نہیں ہوسکتا۔ اس کی بابت غالباً ہم آیندہ کچھ کہ سکیں گے۔ امید ہے کہ آپ اس کی توسیع اشاعت میں ضرور حصہ لیں گے اور اپنے حلقۂ احباب، مدارس کے طلبہ و اساتذہ کو بھی اس سالنامہ کی اہمیت کی طرف متوجہ کریں گے

یہ سالنامہ دراصل ایک مستقل کتاب ہوگی اور کتاب ہی سمجھ کر اس کو حاصل کرنا چاہئے

جو حضرات نگار کے خریدار نہیں ہیں اور صرف سالنامہ ہی لینا چاہیں گے ان کے لئے اس کی قیمت (علاوہ محصول ڈاک) تین روپے ہوگی۔

مینجر نگار

مالہ وما علیہ

جگر کی ایک غزل

ماہنامہ سب رنگ شاہجہاں پور کے عید نمبر (۵۳ء) میں جناب جگر کی ایک غزل شایع ہوئی ہے۔ جو بہ حیثیت مجموعی بری نہیں ہے۔ لیکن اگر اٹھارہ اشعار کی پوری غزل شایع کرنے کی جگہ صرف انتخاب آٹھ نو اشعار کا شایع کیا جاتا اور باقی سقیم شعروں کو حذف کر دیا جاتا تو بہتر تھا۔ غزل یہ ہے :-

۱- یہ راز ہم پر ہوا نہ افشا، کسی کی خاص اک نظر سے پہلے
کہ تھی ہماری ہی کم نگاہی ہمیں تھے، کچھ بے خبر سے پہلے

۲- ہر ایک شے غیر معتبر تھی، ترے غمِ معتبر سے پہلے
یہ زندگی خاک زندگی تھی گداز قلب و جگر سے پہلے،

۳- تجھے ہو سیرِ چمن مبارک مگر یہ رازِ چمن بھی سن لے
کلی کلی خون ہو چکی تھی شگفتِ گل ہائے تر سے پہلے

۴- کہاں کہاں اُڑ کے پہونچے شعلے یہ ہوش کس کو یہ کون جانے
ہمیں بس اتنا ہے یاد اب تک لگی تھی آگ اپنے گھر سے پہلے

۵- قفس کی نازک سی تیلیوں کی بھی کچھ حقیقت ہے ہمصفیرو
مگر اُلجھنا پڑے گا شاید خود اپنے ہی بال و پر سے پہلے

۶- کہاں یہ شورش کہاں یہ مستی کہاں یہ رنگینیوں کا عالم
زمانہ خواب و خیال سا تھا ترے فسونِ نظر سے پہلے

۷- خوشا یہ بیماریِ محبت زہے یہ خود داریِ طبیعت
وہی ہیں اب وقفِ دلنوازی وہی تھے جو بے خبر سے پہلے

۸- زمانہ مانے نہ مانے لیکن ہمیں یہی ہے یقین کامل،
جہاں اُٹھا کوئی تازہ فتنہ اُٹھا تری رہگذر سے پہلے

۹- اگرچہ ذوقِ نظارہ میں بھی ہزار ہا مستیاں بھری تھیں
مگر یہ بیباکیاں کہاں تھیں ترے حجابِ نظر سے پہلے

۱۰- اُٹھا جو چہرے سے پردۂ شب سمٹ کے مرکز پہ آگئے سب
تمام جلوے جو منتشر تھے طلوعِ حسنِ بشر سے پہلے

۱۱- مری طبیعت کو حسنِ فطرت سے ربطِ باطن نہ جانے کیا ہے
مری نگاہیں کبھی نہ اُٹھیں طہارتِ چشمِ تر سے پہلے

۱۲- وہ یادِ آغازِ عشق اب تک انیسِ جان و دلِ حزیں ہے
وہ اک جھجک سی وہ اک جھپک سی ہر التفاتِ نظر سے پہلے

۱۳- ہمیں تھے کیا جستجو کا حاصل ہمیں تھے کیا آپ اپنی منزل
وہیں پہ آکر ٹھہر گیا دل چلے تھے جس رہ گزر سے پہلے

۱۴- بس اک دل اور کیف و لذت بس ایک ہم اور جمالِ فطرت
یہ زندگی کس قدر حسیں تھی شعورِ فکر و نظر سے پہلے

۱۵- سفر تو اک شرطِ جستجو ہے مگر جو ہے شرطِ ہمرہی بھی
مرے جنوں کا بھی ساتھ دیگا یہ پوچھ لوں راہبر سے پہلے

۱۶- ہمارے شوقِ جنوں ادا کی ستم ظریفی تو کوئی دیکھے
کہ نامہ بر کو روانہ کرکے پہونچ گئے نامہ بر سے پہلے

۱۷- کہاں تھی یہ روح میں لطافت کہاں تھی کونین میں یہ وسعت
حیات ہی جیسے سو رہی تھی کسی کی پہلی نظر سے پہلے

۸- یہ نالہ کیوں ہے، یہ نغمہ کیوں ہے، یہ آہ کیسی یہ واہ کیسی
یہ پوچھ لے آئینے کے دل سے نہ پوچھ اپنے جگر سے پہلے

۱- پہلے شعر میں کوئی فنی نقص نہیں ہے۔ البتہ "خاص اک نظر" میں ہلکی سی تعقید ضرور ہے۔ اگر لفظ اک، خاص سے پہلے

لایا جاسکتا تو بہتر تھا، لیکن چونکہ وزن کی مجبوری سے یہ ممکن نہ تھا اس لئے یہ پورا ٹکڑا بدلنا چاہئے تھا، اگر پہلا مصرعہ یوں ہوتا تو مناسب تھا:

یہ راز ہم پر ہوا نہ افشا کسی کے لطف نظر سے پہلے

مفہوم کے لحاظ سے بھی شعر میں تھوڑی سی اُلجھن پائی جاتی ہے۔ شعر کے الفاظ سے جو مفہوم پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ "تیری نظرِ خاص کے بعد ہی ہم کو یہ معلوم ہوا کہ کم نگاہی اور بے خبری ہماری تھی" لیکن یہ مفہوم ناقص ہے کیونکہ جب تک یہ نہ بتایا جائے کہ کم نگاہی کا تعلق کس چیز سے تھا اور بے خبری کس بات سے تھی، مفہوم پورا نہیں ہوتا۔ اگر اس خلا کا پُر کرنا ذہن سامع پر چھوڑ دیا جائے تو شعر کا مفہوم مختصراً یہ ہوگا کہ "کسی کی نظرِ خاص سے پہلے ہم کو یہ خبر نہ تھی کہ اسے بھی ہم سے لگاؤ ہے" لیکن اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ محبّت تو محبّت کی نظر کے بعد ہی پہچانی جاسکتی ہے۔

۲- دوسرے شعر میں کوئی نقص نہیں۔ لیکن شعر کو مطلع بنانے کے لئے پہلے مصرعہ کا قافیہ غیر ضروری تھا۔ "ترے غم سے پہلے ہر ایک شے غیر معتبر تھی" کہنا بالکل کافی تھا۔ غمِ محبت کے لئے معتبر کی تخصیص کوئی معنی نہیں رکھتی۔

۳- تیسرے شعر کے دوسرے مصرعہ میں "شگفتِ گل" کی ترکیب محل نظر ہے۔ فارسی میں کھلنے کے مفہوم میں ہمیشہ شگفتگی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ شگفتن کا حاصل مصدر شگُفت اہلِ زبان میں رائج نہیں، اور دوسرے مصادر پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ شِگِفت (بہ کسرۂ شین و کاف) ضرور مستعمل ہے لیکن اس کے معنی حیرت و تعجب کے ہیں۔

سعدی کا شعر ہے:- بخندید و انگشت بر لب گرفت

کزو ہر چہ آید نہ باشد شِگِفت

صاحب ہفت قلزم نے البتہ لکھا ہے کہ شگُفت، پھول کھلنے کے معنی میں بھی آتا ہے، لیکن اس کی کوئی مثال پیش نہیں کی، کسی صاحبِ زبان کے کلام میں شگُفت کا استعمال، شگفتگی کے مفہوم میری نگاہ سے اس وقت تک نہیں گزرا۔

۴- چوتھا شعر صاف ہے۔ دوسرے مصرعہ میں اب تک کا لفظ البتہ غیر ضروری ہے۔ محض وزنِ شعر پورا کرنے کے لئے لایا گیا ہے۔

۵- چھٹے شعر کے دوسرے مصرعہ میں "خواب و خیال" کا فقرہ کمزور ہے۔ اس کی جگہ کوئی ایسا فقرہ ہونا چاہئے تھا جو شورش، مستی و رنگینی کا ضد ہوتا۔ محض "خواب و خیال" کہدینے سے تقابلی زور پیدا نہیں ہوتا۔ دوسرا مصرعہ یوں ہوتا تو مناسب تھا:-

"زمانہ بے کیف و رنگ سا تھا ترے فسونِ نظر سے پہلے"

۶- آٹھویں شعر کے پہلے مصرعہ میں لفظ یہی کا استعمال غیر ضروری ہے۔ پہلا مصرعہ یوں بھی ہوسکتا تھا:-

زمانہ مانے نہ مانے لیکن ہمیں ہے اس کا یقین کامل

دوسرے مصرعہ کا اندازِ بیان اُلجھا ہوا ہے۔ لفظ جہاں کہنے سے مصرعہ کا مفہوم یہ ہوگا کہ "جس جگہ کوئی نیا فتنہ اُٹھا وہ پہلے تری رہگزر سے اُٹھا"، حالانکہ یہ ممکن نہیں۔ جو تازہ فتنہ کسی جگہ سے اُٹھے گا وہ پہلے کسی اور جگہ سے کیسے اُٹھ چکا ہوگا۔ اگر جہاں کے بجائے جب یا جب کبھی ہوتا تو بیشک درست ہوسکتا تھا۔

۷- نویں شعر کے پہلے مصرعہ میں تھی کا استعمال بے محل ہے۔ اس کا استعمال اس وقت مناسب تھا جب دوسرے مصرعہ میں کوئی ایسا لفظ لایا جاتا جو "ذوقِ نظارہ" کے کسی اور ارتقائی منزل کو ظاہر کرتا۔

دوسرے مصرعہ میں "حجاب نظر" غور طلب ہے۔ شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ میرے ذوقِ نظارہ میں پہلے بھی مستیاں بھری تھیں، لیکن تیرے حجاب نظر کے بعد (خواہ وہ حجاب یا پردہ شرم کا ہو یا کسی اور چیز کا) اس میں بیباکیاں بھی پیدا ہوگئیں۔ حالانکہ بیباکی کا موقع رفع حجاب کے بعد ہوتا ہے نہ کہ حجاب کے بعد۔ اگر "بیباکیاں" کے بجائے "بیتابیاں" ہوتا تو یہ عیب رفع ہوجاتا۔

۸ - دسویں شعر میں "حسنِ بشر" کا فقرہ سمجھ میں نہیں آیا - ہو سکتا ہے کہ کاتب کی غلطی ہو اور "حسنِ سحر" کو اس نے "حسنِ بشر" لکھدیا ہو - لیکن اس صورت میں حسن کا لفظ بیکار ہو جائے گا - "طلوع سحر" کافی ہے -

۹ - گیارھویں شعر میں "طہارتِ چشمِ تر" بڑا دلچسپ ٹکڑا ہے - جگر صاحب نے لفظ طہارت بالکل فقہی معنی میں استعمال کیا ہے، جسے آبدست اور استنجا بھی کہتے ہیں - جگر صاحب غالباً یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جب تک آنکھیں آنسوؤں سے تر نہیں ہو گئیں مری نگاہیں حسنِ فطرت کے مطالعہ کے لئے نہیں اٹھیں - اس میں شک نہیں خیال اچھا ہے، لیکن اسکو ادا کیا اس طرح جس سے چشمِ تر کی نجاست و طہارت کا مسئلہ زیادہ نمایاں ہو گیا جو ذم کا بہت برا پہلو ہے -

۱۰ - تیرھویں شعر میں ایک معنوی نقص ہے جس کی طرف جگر صاحب کی نگاہ نہیں گئی - پہلے مصرعہ میں انھوں نے اپنے ہی آپ کو جستجو کا حاصل اور اپنی منزل ظاہر کیا ہے، اور اس کا ثبوت یہ دیا ہے کہ دل جس رہگزر سے چلا تھا آخر کار وہیں آکر ٹھہر گیا - حالانکہ اس صورت میں رہگزر "مرکز و منزل" قرار پائے گی جہاں دل جاکر ٹھہرا تھا نہ کہ شاعر - عاشق خاک رہگزر تو ہو سکتا ہے لیکن رہگزر نہیں -

۱۱ - چودھویں شعر کا دوسرا مصرعہ بہت صاف و پاکیزہ ہے لیکن پہلے مصرعہ میں وہ سلاست و روانی نہیں ہے - بس ایک دل اور بس ایک ہم کی تخصیص نے خیال کی وسعت کو بھی کم کر دیا -

۱۲ - پندرھویں شعر کا دوسرا مصرعہ بہت صاف ہے، لیکن پہلے مصرعہ کو لفظ جو نے خراب کر دیا - پہلا مصرعہ تھوڑی سی تبدیلی چاہتا ہے :-

"سفر تو بس شرط جستجو ہے، مگر ہے اک شرط ہم ہی بھی"

۱۳ - سترھویں شعر کے دوسرے مصرعہ میں - "حیات ہی" میں ہی بیکار ہے - مصرعہ کا پہلا ٹکڑا یہ ہوتا تو بہتر تھا:-

"حیات گویا کہ سو رہی تھی"

۱۴ - مقطع کے دوسرے مصرعہ میں "پوچھ لے" کا لے بیکار ہے - صرف پوچھ ہونا چاہئے علاوہ اسکے آئینہ کا دل بھی کچھ نہیں - "اپنے آئینہ سے" کہنا چاہئے تھا -

---

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دینے والی

(انجیل انسانیت)

من و یزداں کامل

(جدید اڈیشن)

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو "انسانیتِ کبریٰ و اخوتِ عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقاید، رسالت کے مفہوم اور صحایف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشا اور پرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے - قیمت سات روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

مینیجر نگار لکھنؤ

قدرت کی ایک خاموش مخلوق

کروروں سال زمین پر ایسے گزرے ہیں جب اس پر کسی جاندار کا نام و نشان تک نہ تھا، اس طویل عرصہ میں جس کا اندازہ لگانے سے عقل انسانی بالکل قاصر ہے، زمین بالکل مشتعل حالت میں آگ کا ایک کرہ تھی اور کسی قسم کی زندگی کا وجود میں آنا ناممکن تھا، اس حالت پر کروروں سال گزر جانے کے بعد رفتہ رفتہ اُس کی بیرونی سطح ٹھنڈی ہونے لگی اور اس آتشیں کرے پر ایک خول سا جمنے لگا جس کو علم طبقات الارض میں "قشرالارض" (یعنی زمین کا چھلکا) کہتے ہیں۔

یہ چھلکا کئی مرتبہ بنا اور ٹوٹا، لیکن دبازت بڑھتی گئی، اور پگھلے ہوئے مادے کی تہیں ایک دوسرے پر جمتی چلی گئیں، غار اور گڑھے جو متعدد بار اندرونی حرارت کے زور مارنے اور مادے کو کہیں توڑنے اور کہیں اُبھارنے سے پیدا ہوگئے اُن میں پانی بھر گیا، لیکن اب بھی اندرونی گرمی کی شدت سے بخارات کی کثرت تھی اور زمین پر گیس ہی گیس چھائی ہوئی تھی، امتداد زمانہ سے جب حرارت میں کمی واقع ہوئی اور قشرالارض اعتدال کی طرف قریب ہوا تو سب سے پہلی جاندار چیز وجود میں آئی، لیکن ہمارے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ یہ زندہ چیز کہاں سے اور کس طرح پیدا ہوئی اور نہ یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ اُس چیز کی حقیقت کیا تھی۔

تخلیق حیات کی ابتدائی تاریخ بالکل مجہول ہے، البتہ محتاط نظریہ یہ ضرور بتاتا ہے کہ سب سے پہلے وجود میں آنے والی چیز از قسم جراثیم تھی۔ اس کے ساتھ ہم ایک اور بات یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ زندہ چیز نہ تو قطعی طور پر حیوان کہی جاسکتی تھی اور نہ نبات، گویا یہ جاندار اس تردد میں تھے کہ وہ نباتی زندگی اختیار کریں یا حیوانی، ایک حیثیت سے وہ نباتات سے قریب تر ضرور تھے اور وہ یہ کہ وہ اپنی غذا پانی، کاربانک ایسڈ گیس (کاربن ڈائی آکسائڈ) اور اُس نمک سے حاصل کرتے تھے جو سمندر کے پانی میں پایا جاتا ہے، اور وہ اس قابل تھے کہ اُس قوت سے کام لیں جو آفتاب کی روشنی میں پائی جاتی ہے تاکہ وہ سادہ قسم کے مادوں سے کاربن کمپاؤنڈ بنا سکیں۔

تمام زندہ چیزوں کے شجرۂ نسب کو ایک مشجر قسم کا حرف بنا کر سمجھنا آسان ہوگا اس حرف کے داہنے بازو کو حیوانی ارتقا کی لائن سمجھنا چاہئے، اور اُس نقطہ کو جہاں سے دونوں بازو شروع ہوتے ہیں پہلا جاندار فرض کرنا چاہئے جس سے ایک طرف حیوانات کا اور دوسری طرف نباتات کا سلسلہ شروع ہوگیا اور ہر بازو سے جو چھوٹی چھوٹی شاخیں نکلتی ہیں وہ حیوانات اور نباتات کی مختلف انواع ہیں جو ارتقائی سلسلہ میں پیدا ہوتی چلی گئی ہیں، اس شکل میں حیوانی بازو کو نباتی سے بہت زیادہ لمبا بنانا چاہئے، کیونکہ حیوانات کا تنوع نباتات کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ ایک گلہری اور ایک آم کے درخت میں بڑا فرق ہے لیکن یہ معلوم کرنا بہت مشکل ہے کہ ابتدائی حیوان اور نباتات میں کب سے فرق پیدا ہوا مثلاً اسفنج (حیوان کی ابتدائی شکل) اور مشروم (کگرمتا سادہ قسم کے ابتدائی نباتات) نے کس طرح ایک دوسرے سے علحدہ لائن اختیار کی، اور اس سے زیادہ یہ بات معلوم کرنا مشکل ہے کہ ایک خلیہ ([illegible]) والا جاندار نباتات میں شامل ہے یا حیوانات میں، خاص طور پر جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض سادہ قسم

کے حیوانی جاندار اپنے اندر سبز رنگ والے مادے کلوروفیل (Cholorophyll) کو جمع رکھ سکتے ہیں جو تقریباً ہر پودے کی خصوصیت ہے۔

مذکورہٴ بالا V کے اُس نقطہ پر جہاں سے اُس کے دونوں بازو شروع ہوتے ہیں ایسے جاندار رکھنا چاہئے جن کو نہ یقینی طور پر حیوان کیا جاسکتا ہے اور نہ نبات ایسے جانداروں کو اصطلاح میں (Protista) کہتے ہیں۔

کروروں سال گزر جانے پر ایک خلیہ والے جاندار میں کلوروفل پیدا ہوا جو ایک غلاف میں بند تھا جس کو اصطلاح میں "سلولوس" "Cellulos" کہتے ہیں اور اُس کے اندر شکر (نشاستہ) اور کاربن کے دوسرے مرکبات پیدا ہونے لگے، اور اسی کو ہم سب سے پہلا پودا کہہ سکتے ہیں، لیکن یہ پودے ایک جگہ قایم نہیں تھے بلکہ سمندر میں آزادی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ بہے پھرتے تھے اور نہایت معمولی و سادہ قسم کی کیمیائی مرکبات پر زندہ رہ سکتے تھے، جن کی طیاری میں سورج کی روشنی مدد کرسکتی تھی۔

اس میں شک نہیں کہ حیوانات کی ابتدا بہت سادہ قسم کے جانوروں سے ہوئی ہے اور حیوانات و نباتات نے اُسی وقت ایک دوسرے سے علحدہ ہونا شروع کیا، جب نباتات کی ایک قسم نے اپنے لئے خود غذا پیدا کرنا چھوڑ دیا اور دوسرے نباتات کی طیار کردہ غذا پر زندہ رہنے کی عادت اختیار کرلی۔ یہیں سے حیوانی زندگی کی ابتدا ہوتی ہے، حیوان اور نبات میں یہی فرق ہے کہ نباتات اپنی غذا اپنی ضرورت سے زیادہ خود ہی اپنے اندرونی کیمیاوی عمل سے پیدا کرلیتے ہیں، اور حیوانات خود غذا اپنے اندر فراہم نہیں کرتے بلکہ نباتات کی طیار کردہ غذا پر زندہ رہتے ہیں

حیوانات اور نباتات کے مذکورہ دونوں بازو V جتنا آگے بڑھتے ہیں اُتنا ہی ایک دوسرے سے دور ہوتے جاتے ہیں یعنی ارتقائی رفتار میں اُن کا درمیانی فرق بڑھتا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود بعض نباتات میں حیوانات اور بعض حیوانات میں نباتات کی خصوصیات پائی جاتی ہیں، بعض ایسے پودے ہیں جو کیڑے مکوڑوں کا شکار کرکے اپنی غذا بنا لیتے ہیں۔

اسی طرح بہت سی نباتی خصوصیات بعض جانوروں میں ملتی ہیں، اسفنج اور مونگا ان کی مثالوں میں پیش کیا جاسکتا ہے یہ در اصل سمندری جانور ہیں، لیکن اُن کا جسم بہت کم حرکت کرنے اور شاخ در شاخ ہونے میں درختوں سے مشابہ ہے، خاص کر جب کہ وہ چھوٹے ہوں تو یہ مشابہت اور بھی بڑھ جاتی ہے، اِن کے حرکت کرنے والے جانوروں میں بہت سے ایسے ہیں جو اپنے اندر ایک بڑا غذائی ذخیرہ جمع کرلیتے ہیں جو ضرورت کے وقت اُن کے کام آتا ہے، یا اُن کی اولاد کو میراث کے طور پر مل جاتا ہے۔

نباتی خصوصیات رکھنے والے بعض جانور ایسے ہیں کہ درختوں کی طرح ماحول کے ناموافق ہونے سے اُن کا ایک حصّہ مردہ ہوجاتا ہے اور باقی زندہ رہتا ہے، اور بعض ایسے ہیں جو مرنے کے بعد اپنے اندر درختوں کے بیج کی طرح جرثومہٴ حیات قایم رکھتے ہیں، جو سخت سے سخت سردی میں بھی زندہ رہتا ہے اور اُسی سے اُن کی آیندہ نسل کا تسلسل قائم رہتا ہے۔

بعض سبز رنگ کے ایسے جانور بھی پائے جاتے ہیں جن کی سبزی اس وجہ سے نہیں ہے کہ خود اُن کے اندر کلوروفل پایا جاتا ہے بلکہ یہ سبزی اصل میں اُن چھوٹے چھوٹے نباتی مادہ کی وجہ سے اُن کے خلایہ میں پایا جاتا ہے۔

نباتات کی دنیا بہت وسیع ہے اور مشکل سے کوئی جگہ ایسی ہوسکتی ہے جہاں نباتات کا وجود نہ ہو حتیٰ کہ برف

کے عظیم الشان تودوں پر بھی ایک سُرخ قسم کی نباتی چیز ہوتی ہے جس کو اصطلاح میں Red Snow کہتے ہیں اور بعض سادہ قسم کے پودے گرم چشموں میں پائے جاتے ہیں، بلکہ ڈاکٹری تحقیقات نے تو یہ ثابت کردیا ہے کہ انسان کی غذا کی نالی میں بھی ایک نباتی مادہ پیدا ہوتا ہے جس کو " Flora of food canal " کہتے ہیں۔

عالم نباتات ہر طرف حُسن سے معمور ہے، خاص کر پھولوں کی دُنیا تو حُسن سے بھری پڑی ہے، اگر آپ اُن پودوں کو دیکھیں جو سمندر کی تہ میں پیدا ہوتے ہیں، تو آپ اُن کے رنگ اور شکلوں کو دیکھ کر حیران رہ جائیں۔

یہ نباتات کے حُسن کا پہلو ہے، اب ذرا ان کی عظیم الشان طاقت کو غور کیجئے، عام طور پر ہم طاقت کا یہ مفہوم سمجھتے ہیں کہ ایک پہلوان بڑے سے بڑا وزن اُٹھا سکے، لیکن ہم یہ غور نہیں کرتے کہ ایک تناور درخت کس طرح ہزاروں من کا وزن زمین کی کشش کے خلاف اُٹھائے رہتا ہے۔ ہم ڈائنامیٹ کی توڑ پھوڑ والی طاقت کو بڑی حیرت سے دیکھتے ہیں لیکن اُس طاقت کی طرف ہمارا ذہن منتقل نہیں ہوتا جو ایک بڑے درخت کی جڑوں میں پائی جاتی ہے، اُسکی جڑیں کس طرح زمین کو چیرتی ہوئی غذا کی تلاش میں کہاں سے کہاں پہونچ جاتی ہیں، کس طرح زمین کو پھاڑتی ہوئی چٹانوں سے لپٹتی ہوئی اپنا کام پورا کرتی رہتی ہیں۔ ہم کو اُن بڑے بڑے کارخانوں کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے، جن میں عظیم الشان مشینیں سیکڑوں آدمیوں کی مدد سے کیمیاوی اجزا کی ترکیب وتحلیل کا کام شور مچاتے ہوئے انجام دیتی رہتی ہیں لیکن ہم اُس کارخانہ سے غافل ہیں جو ہر ایک سبز پتے میں خاموشی کے ساتھ یہی کام کرتا رہتا ہے۔

نباتات کی نشوونما کے لئے اُن کا ماحول سازگار ضرور ہے، پانی، کہر، بادل، ہوا وغیرہ بہت سی چیزیں درختوں کو مدد پہونچاتی ہیں لیکن اِن تمام مادوں کی فراوانی کے باوجود نباتات کو اپنا وجود قایم رکھنے کے لئے بڑے جدوجہد کی ضرورت پیش آتی ہے، کیونکہ جس ماحول میں وہ پرورش پاتے ہیں وہ ہر وقت بدلتا رہتا ہے اور بعض نباتات ان تبدیلیوں کو برداشت کرکے زندہ رہتے ہیں، بعض مرجاتے ہیں

جس طرح کہ موسم کی مناسبت سے ہم اپنے لباس میں تبدیلی کرتے رہتے ہیں، اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ پودے اپنے اندر اختلاف موسم کو برداشت کرنے کے لئے تبدیلی کرتے ہیں، جن مقامات پر بارش زیادہ ہوتی ہے، اور اُس کے بعد زیادہ عرصے تک پانی نہیں برستا وہاں بعض پودے ایسے ہوتے ہیں جن کے جسم میں پانی جمع رکھنے کے خلایا پائے جاتے ہیں، بعض پودوں کی کھال موسم کی سختی برداشت کرنے کے لحاظ سے موٹی اور پتلی ہوتی رہتی ہیں، بعض اس ضرورت کے تحت اپنے پتے کم کردیتے ہیں، اور بعض کے تنوں کی سبزی گھٹتی اور بڑھتی رہتی ہے، بعض پودوں پر موسم سرما کی سختی برداشت کرنے کے لئے اون کی طرح ریشہ دار چیز اُن کے پتوں اور شاخوں کو چھپائے رہتی ہے۔

نباتات میں اپنی نسل کو قایم رکھنے اور بڑھانے کا طریقہ حیوانات سے کہیں زیادہ کامیاب ہے، بعض درختوں کے بیج اس کثرت سے ہوتے ہیں کہ ایک پودا ایک مرتبہ ساڑھے ساتھ لاکھ سے زیادہ بیج پیدا کردیتا ہے اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر اُس کے ہر بیج کو درخت بن جانے کا موقع دیا جائے تو اُس کی آیندہ نسل تمام روئے زمین پر چھا جائے لیکن ایسا نہیں ہوتا اس لئے کہ جہاں ماحول پودوں کے پیدا ہونے کے لئے سازگار ہے وہاں مخالف طاقتیں بھی پائی جاتی ہیں، بیج کی کثرت میں مصلحت صرف اس قدر ہے کہ درخت کی نسل قایم رہے۔

حیوانات اور نباتات کو اپنی ہستی قایم رکھنے کے لئے غذا کی ضرورت ہے، یہ بات ہم ابھی معلوم کرچکے ہیں کہ سبز درخت کاربن ڈائی آکسائڈ پر زندہ رہتے ہیں جو ہوا میں پایا جاتا ہے اور پتوں کے ذریعہ نباتات کی غذا

بن جاتا ہے، اسی طرح وہ پانی پر زندہ ہیں جس کو وہ عام طور پر جڑوں کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں، اور مختلف قسم کے نمکوں پر جو جڑوں کی مدد سے پانی کے ساتھ زمین سے چوستے ہیں، عام طور پر یہ سادہ غذائیں کثرت سے پائی جاتی ہیں، لہذا اس قسم کی غذا کے لئے جدوجہد کے یہ معنی ہیں کہ ان کی آمد قایم رہے اور اپنے ہم جنس درختوں سے اُس کے حصول میں مقابلہ ہوتا رہے۔

بعض دلدل کی جگہوں پر جہاں ہر وہ مادہ نہیں پایا جاتا جس سے نباتات غذا حاصل کرتے ہیں وہاں کے نباتات اس کی کمی کو ایک عجیب طریقہ سے پورا کرتے ہیں" ایسے مقامات کے اکثر پودے کیڑے مکوڑوں کا شکار کرکے اُن کو اپنی غذا بنا لیتے ہیں۔

اب ہم ذرا تفصیل سے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ درختوں کو اپنی زندگی قایم رکھنے کے لئے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔ چونکہ حیوانات کے مقابلہ میں درخت بالکل ساکن نظر آتے ہیں اس لئے ہم اُن کی قوتِ عمل کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتے حالانکہ ان کو جڑوں اور پتوں کے ذریعہ غذائی مادہ حاصل کرنے اور اُس کو ہضم کرنے میں بڑا کام کرنا پڑتا ہے وہ اس طریقہ پر مادۂ خام حاصل کرکے اُس کو کاربن کمپاؤنڈ— شکر اور اسٹارچ (نشاستہ) دُہنیت، اور پروٹین میں تبدیل کر دیتے ہیں اور اپنی اس طیار کردہ غذا کو اپنا وجود قایم رکھنے، اُس کو بڑھانے اور ذخیرہ جمع رکھنے کیلئے کام میں لاتے ہیں، ایک سبز درخت کا بڑا کام یہ ہے کہ زندگی قایم رکھنے والے مادے کو بڑھاتا رہے، آپ املی کے یا بڑ کے ایک عظیم الشان درخت کو لیجئے، ایک ذرا سے بیج سے ابتدا میں ایک ننھا سا پودا پیدا ہوتا ہے لیکن وہی پودا غذا حاصل کرنے کے عمل کو مسلسل جاری رکھتے ہوئے ایک زبردست بلند اور تناور درخت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ دریائی پودوں کو غذا حاصل کرنے کے لئے بہت کم جڑوں کی ضرورت پیش آتی ہے، کیونکہ وہ اپنے پتوں اور شاخوں کے ذریعہ اپنی سادہ غذا پانی سے حاصل کر لیتے ہیں اور جن دریائی پودوں میں جڑیں نکل آتی ہیں زیادہ وہ ایک جگہ لنگر انداز ہو جاتے ہیں، تاکہ پانی کے بہاؤ کے ساتھ بہہ نہ جائیں لیکن خشکی کے درختوں کے لئے جڑ بڑی اہمیت رکھتی ہے، کیونکہ وہ اُس کے ذریعہ زمین سے غذا حاصل کرتے، اور اُسی کے زمین میں جمے رہنے سے وہ کھڑے رہتے ہیں۔

جڑ کا سِرا نہایت صاف اور نازک ہوتا ہے، ہمیشہ تازہ رہتا ہے اور بڑھتا رہتا ہے، وہ ہر وقت زمین میں اپنے لئے راستہ نکالنے کی کوشش کرتا ہے، بڑھنے والے سرے سے کچھ پیچھے بال جیسی چیز ہوتی ہے جو زمین سے پانی چوستی ہے — اب پتوں کو لیجئے۔ ہر سبز پتہ دنیا میں ایک زبردست کارخانہ ہے۔ یہ کارخانہ اس لحاظ سے بھی بڑا اہم ہے کہ حیوانی اور انسانی زندگی کا تمامتر انحصار اُن غذائی مادوں پر ہے جس کو سبز پتّہ طیار کرتا ہے، ہر پتّہ ایک زندہ "نسیج" (Tissue) کی چادر ہے، حجم کے لحاظ سے بعض پودوں کے پتے اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ بغیر خوردبین کی مدد کے اُن کا دیکھنا ناممکن ہے اور بعض درختوں کے پتے چھ فٹ تک لمبے پائے گئے ہیں۔

پتے کے اندر ایک زبردست رگوں کا جال ہوتا ہے، اگر کسی پتہ کو روشنی کے مقابل دیکھیں تو یہ جال صاف طور پر نظر آئے گا، پتے کی ڈنڈی جو شاخ سے لگی رہتی ہے، اُسی کے ذریعہ اِن رگوں میں غذائی مادہ جڑوں سے آتا ہے اور اُسی کے ذریعہ واپس جڑوں تک پہونچ جاتا ہے۔

محمود علی خاں

"گاہے گاہے باز خواں"—

دشمنِ اسلام کون ہے؟

مذہب یا دین اگر کوئی ایسی حقیقت ہے جو خدا کی طرف سے ظاہر کی گئی ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا حقیقت کبھی بدل سکتی ہے اور کیا خدا اس کو پسند کرتا ہے کہ حقیقت تک پہونچنے میں وہ موانع حایل کرتا رہے۔

آپ کسی پابند مذہب شخص سے سوال کیجئے تو وہ یہ کہنے پر مجبور ہوگا کہ مذہب یقیناً خدا کی ظاہر کی ہوئی حقیقت ہے اور وہ کبھی اس کو پسند نہیں کرتا کہ انسان حقیقت تک پہونچنے سے باز رکھا جائے۔

اچھا اب آپ مختلف مذاہب والوں سے علٰحدہ علٰحدہ پوچھئے کہ جب مذہب خدائی حقیقت ٹھہرا تو اس میں تنوع کی کیا ضرورت تھی اور اس نے مختلف مذاہب پیدا کرکے انسان کو کیوں اُلجھن میں ڈال دیا —— اس کا جواب ایک آتش پرست یہ دیگا کہ حقیقت تو ایک بار زردشت کے ذریعہ ظاہر کی جاچکی ہے —— ایک یہودی کہے گا کہ حقیقت تو صرف موسوی تعلیم کا نام ہے ایک عیسائی دعویٰ کرے گا کہ صداقت کی تبلیغ تو صرف عیسیٰ نے کی، اسی طرح بودھ مت والا، بودھ کی تعلیمات کو، ایک ہندو کرشن کی ہدایات کو اور ایک مسلمان محمد کے بتائے ہوئے معتقدات کو حقیقت و صداقت سے تعبیر کرے گا اور باقی تمام مذاہب کو حقیقت سے دور ظاہر کرکے لغو و باطل قرار دے گا۔

اب غور کیجئے کہ ایک شخص جو مذہب کے خیال سے بالکل خالی الذہن ہے یہ سُن کر کیا اثر قبول کرے گا۔ وہ اگر زیادہ آزادی سے کام لیکر سب کو لغو نہ کہدے گا تو وہ تحقیق و جستجو ضرور کرے گا تاکہ خود کوئی فیصلہ کرکے کسی ایسے نتیجہ پر پہونچے جو اسکے لئے قابل قبول ہو اچھا آیئے ہم آپ بھی بالکل خالی الذہن ہوکر جستجو کریں کہ صداقت کس مذہب کی تعلیمات میں پائی جاتی ہے اور مذہب کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟

اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ امر غور طلب ہے کہ کسی مذہب کو خدا کی بتائی ہوئی حقیقت و صداقت کہنا کیا معنی رکھتا ہے، اس کی دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں، ایک یہ کہ خدا براہ راست اپنے خدائی الفاظ اور اپنی الٰہانہ زبان میں اس کی تلقین فرمائیے یا اپنے کسی خاص بندے میں غور و تامل کی غیر معمولی کیفیت پیدا کرکے اصول مذہب وضع کرنے کی طرف مایل کرے، بہرحال جو صورت بھی ہو اس سے انکار ممکن نہیں کہ مذہب کی صداقت کا تعلق ماحول و زمانہ سے ہوا کرتا ہے اور وقت و حالات کے لحاظ سے اس میں تغیر و تبدل ہونا ضروری ہے کیونکہ مذہب نام ہے اُن اُصول کا جو اصلاحِ اخلاق و معاشرت کے کام آئیں اور چونکہ اخلاق و معاشرت کے معیار کا امتداد زمانہ کے ساتھ بدل جانا ضروری ہے اس لئے وقتاً فوقتاً اصول مذہب کا تغیر بھی لازم ہے۔

انھیں اصول زندگی پر لوگوں کو مستحکم کرنے کے لئے بعض معتقدات دینی وجود میں آئے جو لوگوں کو معاشرتی پابندی پر مجبور کرنے کے لئے ذریعہ و وسیلہ کا کام دیتے تھے، مثلاً یہ کہ جو قانون پیش کیا جاتا ہے وہ خدا کا نازل کیا ہوا ہے اور جس شخص کے ذریعہ سے نازل ہوا ہے وہ خدا کا خاص بندہ ہے اور معجزات کا مالک ہے یا یہ کہ جو شخص اس کی پابندی کرے گا اُسے مرنے کے بعد طرح طرح کے نعائم و لذائذ حاصل ہوں گے اور جو پابندی نہ کرے گا وہ آگ میں ڈالا جائے گا۔

ظاہر ہے کہ ایک شخص جو صرف ان معتقدات کا ماننے والا ہے اور ان سے آگے بڑھکر اپنے اخلاق کو متاثر نہیں ہونے دیتا، بہ لحاظ نتیجہ اس کے یہ دینی عقاید بالکل بیکار ہیں، کیونکہ مقصود تو شارع کا جسے آپ نبی، رسول، مرشد، رشی، دیوتا وغیرہ کے نام سے پکارتے ہیں، پورا ہی نہیں ہوا اور عقاید محض عقاید ہونے کے لحاظ سے انسانی زندگی کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتے۔

الغرض اصل مقصود صرف اصلاح اخلاق و معاشرت ہے اور اس کے حصول کے لئے بعض غیر معمولی دماغ رکھنے والے لوگوں نے دین یا شریعت کو رائج کر کے بعض مخصوص عقاید پیدا کئے تاکہ لوگوں کو ترغیب و تخویف سے حقیقی مدعا کی طرف لا سکیں۔

اس جگہ یہ سوال اُٹھانا کہ عقاید دینی کوئی حقیقت نہیں رکھتے تو کیا انبیاء نے ان کو حقیقت ظاہر کر کے غلط بیانی سے کام نہیں لیا، درست نہیں، کیونکہ اول تو اس امر کا امکان ہے کہ اُن میں سے اکثر نے اُن عقاید کو واقعی حقیقت باور کر کے پیش کیا ہو اور دوسرے یہ کہ اگر بعض نے ایسا نہیں سمجھا تو دوسروں کی اصلاح کے لئے ایسا کرنا قرین مصلحت پایا ہوگا اور مصلحت کے لحاظ سے کوئی بات ایسی کہدینا جو واقعہ کے خلاف ہو کبھی موردِ الزام نہیں ہو سکتا ــــ وہ عقاید دینی جو آج معرض بحث میں ہیں، زیادہ تر مابعد الطبیعیات سے متعلق ہیں، یا خدا کے مفہوم سے، یعنی اہلِ مذاہب ایک بات تو یہ کہتے ہیں کہ حقیقی زندگی تو مرنے کے بعد ہی شروع ہوگی اور وہاں عذاب و ثواب، دوزخ و جنت وغیرہ کے معاملات پیش ہوں گے اور دوسری یہ کہ خدا نام ہے ایک ایسی ہستی کا جس نے تمام عالم کو اس طرح پیدا کیا جس طرح ایک صناع اپنے قایم کئے ہوئے ارادہ کے ساتھ کسی چیز کو طیار کرتا ہے اور وہ خدا قادر ہے، جس وقت جو چاہے تغیر و تبدل کر کے کائنات کے نظام کو بدل دے۔

آپ اگر جستجو کریں گے تو معلوم ہوگا کہ یہ عقاید معہ تمام جزئیات کے کسی ایک قوم یا ملک سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ کم و بیش ہر اُس قوم یا ملک میں پائے جاتے ہیں، جہاں کوئی مذہب پایا جاتا ہے، اس لئے یہ امر غور طلب ہے کہ مہمات عقاید دنیا کی تمام مذہبی قوموں میں کیوں تقریبًا ایک ہی سے پائے جاتے ہیں اور وہ کون تھا جس نے اول اول اُن کو حقایق جان کر پیش کیا۔ ہر چند امر ثانی کی کوئی تعین دشوار ہے لیکن امر اول کی نسبت یہ کہنے میں قطعًا تامل نہیں ہو سکتا کہ ہر جدید مذہب نے اپنے ماسبق مذہب کے معتقدات سے فایدہ اُٹھایا اور یہ سلسلہ عہدِ قدیم تک پہونچ کر اس زمانۂ وحشت تک پہونچ جاتا ہے، جب انسان کے تجربات دُنیا میں بہت تھوڑے تھے اور اس کا علم حد درجہ ناقص و نامکمل تھا ــــ مثلاً آپ جنّت اور حور و غلمان کو لے لیجئے، کیا کوئی مسلمان دعویٰ کر سکتا ہے کہ اسلام سے قبل یہ خیال یا عقیدہ کسی اور مذہب میں نہ پایا جاتا تھا ــــ اگر آپ قدیم ایرانی اور آرین لٹریچر کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ تقریبًا یہی عقیدہ اس زمانہ میں بھی پایا جاتا تھا، فارسی زبان میں ایک لفظ پری ہے جو قدیم ایرانی زبان میں "پیرک" تھا اور پیروانِ زردشت کا عقیدہ تھا کہ یہ آسمانی دیویاں ہیں جو ہوا میں رہتی ہیں اور اس قدر جمیل ہیں کہ ان کو دیکھتے ہی انسان فریفتہ ہو جاتا ہے، چنانچہ خود عربی کا لفظ فردوس، ایرانی لفظ ہے ــــ لفظ حور کے متعلق ہمارے علماء کا خیال ہے کہ وہ خالص عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی میں سفیدی و پاکیزگی کا مفہوم غالب ہے، درآنحالیکہ اس کا ماخذ اوستا کا لفظ "ہورہ" ہے جسے پہلوی زبان میں ہور اور موجودہ فارسی میں حور کہتے ہیں جس کے معنی نور، روشنی اور مجازًا آفتاب کے ہیں۔ حور و غلمان کا عقیدہ ہندوؤں میں بھی پایا جاتا ہے اور ان کے لئے اپسرائیں اور گندھرب کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں ــــ کسی غزوہ میں مارے جانے پر شہید ہونے اور جنت میں جانے کا خیال بھی آرین خیال ہے۔ چنانچہ دھرم شاستر میں لکھا ہے کہ "جنگ میں جو لوگ بہادری سے لڑتے ہیں اور پیٹھ نہیں دکھاتے وہ بہشت میں جاتے ہیں"، اسی طرح اندر راجہ نل سے جس وقت خطاب کرتا ہے تو بہشت کا ذکر کرتا ہے ــــ اسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ازل میں تمام روحیں پیدا ہو چکی تھیں اور انھوں نے "قالو بلےٰ" کہا تھا ــــ پارسیوں کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں اوستا میں اس کے لئے لفظ "فروشی" پایا جاتا تھا، اور پہلوی زبان میں اُس کو "فیروہر" کہتے ہیں۔ الغرض یہ عقیدہ کہ روحیں پہلے سے موجود ہیں۔ مجوس کے یہاں پایا جاتا تھا اسی طرح ملک الموت کا خیال بھی مجوس کا خیال ہے اور اُن کے یہاں بھی ایک فرشتہ "استو وید ہوتس"، کے نام سے پایا

جاتا تھا جو روح کو جسم سے جُدا کرتا تھا ـــــ عزرائیل کے متعلق مسلمانوں میں جو روایات پائی جاتی ہیں وہ بھی بہت کچھ قدیم ایرانی روایات سے ملتی جلتی ہیں اور آدم و ابلیس، سانپ اور طاؤس کے متعلق جو کچھ مسلمانوں میں بیان کیا جاتا ہے وہ بھی مجوسی روایات میں نظر آتا ہے، اسی طرح میزان، صراط، نورِ محمدی، حشر و نشر، حساب و کتاب، دوزخ و جنت وغیرہ کے متعلق جو اعتقادی مسایل اسلام میں پائے جاتے ہیں وہ قبل اسلام بھی بعض مذاہب میں پائے جاتے تھے اور اگر تمام مذاہب کی چھان بین کی جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک وقت نامعلوم سے یہ خیالات نوعِ انسانی میں پرورش پاتے چلے آرہے ہیں اور انسان کی بالکل ابتدائی ذہنی نشو و نما کی یادگار ہیں ـــــ ابتدائے عہدِ انسانی میں جب کوئی شخص غیر معمولی عقل و ذہانت رکھنے کی وجہ سے اپنے قبیلہ کا سردار بن جاتا تھا تو اس پر دو فرض عاید ہوا کرتے تھے، ایک یہ کہ وہ قبیلہ کے تمدنی و معاشرتی نظام کو قایم رکھے اور دوسرے یہ کہ وہ افرادِ قبیلہ کے دل میں پیدا ہونے والی اُلجھنوں کو دور کرے۔

لوگ رات کو خواب دیکھتے تھے اور اس سے آکر پوچھتے تھے کہ اس کا کیا مطلب ہے، کوئی مرجاتا تھا تو اس سے دریافت کیا جاتا تھا کہ وہ کہاں گیا، کسی کو کوئی مرض لاحق ہوتا تھا تو اس سے استصواب کیا جاتا تھا، الغرض اُن کی ہر خواہش و جستجو کا مرکز سردارِ قبیلہ ہوا کرتا تھا اور اُسے اپنا منصب قایم رکھنے کے لئے کوئی نہ کوئی جواب دینا پڑتا تھا ـــــ کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اس کی قایدانہ حیثیت ضعیف ہوجاتی اور قبایلی نظم و نسق میں وہ کامیاب نہ ہوسکتا ـــــ پھر چونکہ مرنے والوں کے ساتھ زندگی میں محبت و رفاقت کا جذبہ متعلق ہوتا تھا اور ان کی جدائی سے لوگوں کو تکلیف پہونچا کرتی تھی، اس لئے بقاءِ روح کے خیال سے اُن کو تسکین دی گئی اور روح کو عذاب و ثواب کا محل قرار دے کر ترغیب و تخویف کی وہ صورتیں اختیار کی گئیں، جو اصلاحِ قبایل اور اصولِ معاشرت کے قیام کے لئے ضروری تھیں۔

اس میں شک کرنے کی گنجایش نہیں کہ جتنے مذہبی معتقدات دنیا میں پیدا ہوئے وہ سب نتیجہ ہیں قیاس کا اور چونکہ قیاس کا تعلق موجودات کے تصورات سے ہوا کرتا ہے اس لئے حیات بعد الموت کے متعلق بھی ایک انسان نے اپنے قیاس سے کام لے کر وہی باتیں کہیں جو دُنیاوی زندگی میں پیش آتی ہیں ـــــ خدا کا وہی قہرمانی تصور جو دُنیاوی بادشاہوں کا ہوا کرتا ہے، اس کا وہی مختارِ کل ہونا جو ایک مستبد حکمراں انسان کی خصوصیت ہے۔ بہشت میں انھیں لذایذ و نعائم کا ذکر کرنا جن کی خواہش دنیا میں ہوا کرتی ہے اور دوزخ کے وہی دل دہلا دینے والے مناظر بیان کرنا، جن سے عالم آب و گل میں ایک انسان پر دہشت طاری ہوجاتی ہے۔ یہ سب اسی قیاس کی بنا پر تھے جو تجرباتِ دُنیا کے سلسلہ میں قایم کیا گیا اور جس کے بغیر کوئی چارہ بھی نہ تھا ـــــ مثلاً آپ اسلام ہی کو لیجئے کہ جس سرزمین میں اس کا ظہور ہوا وہاں کے باشندوں کی کیا حالت تھی دنیوی لذایذ و نعائم میں عورت، شراب، دودھ، شہد اور فواکہ ان کا انتہائی نقطۂ نظر تھا اور ان کی قساوت و سنگدلی کا یہ عالم تھا کہ گرم گرم پتھر پر لٹا کر ایک آدمی کو مار ڈالنا ان کا روز کا مشغلہ تھا، جہل و لاعلمی کا یہ عالم تھا کہ اپنی بے علمی و بے خبری پر فخر کیا کرتے تھے اور باہم کر معمولی معمولی باتوں پر سالہا سال تک کشت و خون جاری رہنا وہاں کا معمولی منظر تھا، باوجود ایک ہی سرزمین میں سانس لینے کے ہر قبیلہ کا معبود جُدا تھا اور افتراق کی وہ تمام مکروہ صورتیں جو بھائی کو بھائی سے اور گوشت کو ناخن سے جُدا کر دیا کرتی ہیں اُن میں بدرجۂ کمال پائی جاتی تھیں ـــــ ظاہر ہے کہ اس حالت میں ایک مصلح یا رفارمر کا اولین فرض یہی ہونا چاہئے تھا کہ وہ ان کو ایک مرکز پر لائے اور سب کو ایک خیال مشترک سے وابستہ کر دے، چنانچہ سب سے پہلے ان کو خدا کی توحید کی طرف دعوت دی گئی۔

ہرچند اللہ اور اللہ کی توحید کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے اہلِ عرب واقف نہ رہے ہوں لیکن اس میں کلام نہیں کہ وہ اس چیز کو بالکل بھلا چکے تھے اور اسی لئے ان کا شیرازہ درہم و برہم ہوچکا تھا ـــــ ظاہر ہے کہ محض خدا کو ایک کہنا تو سود مند نہ ہوسکتا تھا اس لئے اصلاحِ معاشرت کے لئے اور وہ صورتیں بھی اختیار کی گئیں جو اس سے قبل مفید ثابت ہوئی تھیں اور عذاب و ثواب، بہشت و دوزخ، حشر و نشر وغیرہ کے وہ تمام عقاید علیٰ حالہا قایم رکھے گئے، جن کے بغیر اصلاح ناممکن تھی، اگر جاہل عربوں کے سامنے اظہارِ حقیقت کے طور پر بہشت و دوزخ کا مفہوم صرف روحانی مسرت یا روحانی اذیت بتایا جاتا تو ظاہر ہے کہ ان پر اس کا کوئی اثر نہ ہوتا کیونکہ اس مفہوم

سے وہ آشنا ہی نہ تھے اور ان کے ذہن اس قدر ترقی یافتہ نہ تھے کہ وہ اس کی بلندی کو سمجھ سکتے ـــ لیکن جب ان کو بتایا گیا کہ نعائم فردوس میں وہی تمام لذتیں شامل ہیں جن کے لئے وہ بے چین رہتے ہیں اور عذاب دوزخ اس قسم کی سخت گیریوں کی انتہائی صورت ہے جن سے انھیں یہاں واسطہ پڑتا ہے تو ان کی سمجھ میں مذہب کی اہمیت بھی آئی اور وہ اُن اصول کے بھی پابند ہو سکے جن کی تبلیغ ایک مصلح کا حقیقی مقصد ہوا کرتا ہے ـــ اِس لئے مذہبی معتقدات کے متعلق یہ گفتگو کرنا کہ وہ حقیقتاً لغو و باطل تھے اِن معتقدات کی اہمیت کو کم نہیں کر سکتا کیونکہ اُن سے جو کام لینا مقصود تھا وہ پورا ہو کر رہا اور اگر آج ان معتقدات سے ہٹ کر کوئی دوسرا ذریعہ اصلاح اعمال و اخلاق کا اختیار کیا جا سکتا ہے تو مذہب کے حقیقی مقصود کے منافی نہیں اور یہ ایسا باریک نکتہ ہے جس کو سب سے پہلے اسلام اور بانیِ اسلام نے ظاہر کیا ـــ جیسا کہ ہم نے ابتدائی سطور میں بیان کیا ہے، ایک مذہب والا ہمیشہ دوسرے مذہب والے کو گمراہ کہنے کا عادی ہے لیکن قرآن کی تعلیم یہ نہیں ہے اور اُس نے تسلیم کر لیا ہے کہ ہر قوم کے لئے ایک ہادی ہوا کرتا ہے جو اس قوم کی خصوصیات اور زمانہ کی ضروریات کا لحاظ رکھ کر تمدن و معاشرت کے اصول قایم کرتا ہے اور لوگوں کو امن و سکون کی طرف بلاتا ہے ـ آنحضرت نے ہمیشہ یہی کہا کہ میں تم لوگوں کے لئے کوئی نئی چیز نہیں لایا، آپ نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ آپ سے مافوق الفطرت معجزات کا ظہور ہو سکتا ہے، آپ نے مذہب کے باب میں کبھی جبر و اشتداد کو پسند نہیں کیا اور آپ نے اگر بہشت و دوزخ کا وہ عام مفہوم پیش کیا جو جاہلوں کے لئے قابلِ قبول تھا تو دوسری طرف اہلِ علم و عقل کے لئے یہ بھی کہہ دیا کہ یہ سب تشبیہات و استعارات ہیں اور حقیقت سے انھیں دور کا بھی واسطہ نہیں ـــ پھر آپ تمام مذاہب عالم کی تاریخ ڈھونڈھ ڈالئے اور بتائیے کہ کیا محمدؐ کے سوا کوئی اور نبی یا مصلح ایسا ہوا ہے جس نے انسان کی فطری سطح پر آکر کسی مذہب کی بنیاد ڈالی ہو، جس نے اپنے آپ کو "انا بشر مثلکم" سے زیادہ اہمیت نہ دی ہو، جو معجزات اور خرقِ عادات پیش کرنے سے انکار کرتا ہو، جس نے مذہب کے لئے تلوار اُٹھانا حرام قرار دیا ہو، جو تمام دوسرے مذاہب کی عزت کرتا ہو جو واہمہ پرستی و لایعنی مراسم عبودیت کا مخالف ہو اور جو مذہب کا مفہوم صرف اخلاق کی پاکیزگی اور ذہنی ترقی و آزادی قرار دے ـــ اگر انصاف کو ہاتھ سے نہ دیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ محمدؐ کی ذات اس باب میں بالکل منفرد نظر آتی ہے اور اس لئے مذہب ہونے کے لحاظ سے تکمیل کا دعویٰ صرف اسلام ہی کر سکتا ہے ـــ یہ ہیں وہ اصلی خط و خال اسلام اور اسکی تعلیمات کے جو ہر شخص کو غائر مطالعہ کے بعد نظر آسکتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ آج اگر میں ان کو ایک مسلمان کے سامنے بیان کروں تو وہ بھی ان کو صحیح باور نہ کرے گا چہ جائیکہ غیر مسلم، کیونکہ آج خود ہمارے علماءِ کرام اور واعظان ذی احترام کے نزدیک رسول اللہ انسان نہ تھے بلکہ ایک دیوتا تھے جن کے جسم کا سایہ نہ تھا، جن کی پشت پر مُہرِ نبوت ثبت کر کے خدا نے بھیجا تھا جن کے ہاتھ میں سنگریزے بولنے لگتے تھے ـ جن کی رسالت کا اقرار درخت بھی ایک انسان کی طرح کیا کرتے تھے ـ جب وہ جنگ کرتے تھے تو مدد کے لئے آسمانوں سے فرشتے اُترا کرتے تھے اور جب آپ کسی مجمع میں ہوتے تو ہمیشہ آپ سب سے بلند نظر آتے، خواہ اُن سے زیادہ لانبے قد کے آدمی کتنے ہی وہاں موجود ہوں، وہ ایک بُراق پر سوار ہو کر ساتوں آسمانوں کی سیر کرتے ہوئے عرشِ اعظم تک پہونچے اور ذاتِ خداوندی سے ہمکلام ہوئے ـ جبرئیل نے آپ کا سینہ چیر کر دل سے خون کی پھٹکی نکال لی تا کہ معاصی کی اہلیت باقی نہ رہے اور آپ ایک اشارہ سے پہاڑ کے پہاڑ سونے چاندی میں تبدیل کر سکتے تھے ـ پھر یہ واہمہ پرستی یہیں تک پہونچکر ختم نہیں ہو گئی بلکہ صوفیائے کرام نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ احمد اور احد میں تو میم کا پردہ مصلحتاً رکھا گیا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ محمد اور خدا میں کوئی فرق نہیں اور اس طرح صنمیات کا پورا لٹریچر اسلام میں داخل ہو گیا آپ کسی مجلس میلاد میں جا کر شریک ہوں تو آپ کے لئے اس قسم کے معجزات و خوارق عادات سننا ناگزیر ہو گا اور پوری صحبت میں مشکل ہی سے دو چار واقعات اخلاق محمدی کے سننے میں آئیں گے ـ اسلئے موجودہ زمانہ میں جبکہ مذہب کے خلاف ایک عام تحریک دُنیا میں پیدا ہو رہی ہے ـ اسلام کے سامنے یہ سوال نہیں ہے کہ وہ اغیار کے حملہ سے کیونکر محفوظ رہے بلکہ سوال یہ ہے کہ خود اسی کے حامی و علمبردار جو دشمنی اسکے ساتھ کر رہے ہیں اسکو کیونکر دفع کیا جا سکتا ہے، اسکی دو ہی صورتیں ہیں، ایک یہ کہ بزور شمشیر مولویانہ ذہنیت کو ختم کر دیا جائے، یا خود عوام میں علم کی اشاعت اتنی ہو کہ وہ نقد و نسیہ میں تمیز کر سکیں لیکن چونکہ اول الذکر صورت کا امکان نہیں اس لئے صرف دوسری صورت باقی رہ جاتی ہے، جو دیر طلب تو یقیناً ہے، لیکن کسی نہ کسی دن بہرحال اسے پورا ہو کر رہنا ہے۔

خطِ ایام

(ساقی جاوید، بی، اے)

وقت کے آتشکدے شعلے اگلتے ہی رہے
مریم و حوا کے آنچل آہ جلتے ہی رہے

قصر و ایواں میں بھڑکتی ہی رہی سطوت کی آگ
آہ لٹتا ہی رہا عذرا و سلمیٰ کا سہاگ

آندھیاں روشن چراغوں کو بجھاتی ہی رہیں،
ظلمتیں ایام کے بربط پہ گاتی ہی رہیں،

خوں سے دھلتے ہی رہے اسکندر و دارا کے ہاتھ
وقت بڑھتا ہی رہا اک صرصر و طوفاں کے ساتھ

جگمگاتا ہی رہے فغفور و قیصر کے دیار
بابل و روما سے اٹھتا ہی رہا خونیں غبار

زار و سیزر کی سنانیں خوں بہاتی ہی رہیں
سطوتوں کی دیویاں لاشوں پہ گاتی ہی رہیں

جنگ کے شعلوں میں جلتے ہی رہے اہرام و نیل
اف دہکتا ہی رہا فطرت کا ہر نقشِ جمیل

آگ جلتی ہی رہی طوفان آتے ہی رہے
تاج و الحمرا کے سینے زخم کھاتے ہی رہے

اڑ رہی ہے جانے کب سے روم و غرناطہ کی دھول
جل رہے ہیں جانے کب سے کوکب و پرویں کے پھول

آگ یہ صدیوں کی ہے اس کو بجھا سکتا ہے کون
جبر و استبداد کے محلوں کو ڈھا سکتا ہے کون

آج بھی اٹھتے ہیں طوفاں آج بھی جلتی ہے آگ
آج بھی لٹتا ہے مہتاب و ثریا کا سہاگ

آج بھی دہکے ہوئے ہیں طیلسان و رحل و طاق
آج بھی اڑتا ہے قرآن و محمد کا مذاق

آج بھی مسجود ہیں اس دہر میں لات و ہبل
آج بھی کھل کھل کے مرجھاتے ہیں ذہنوں کے کنول

شعلہ زا ہیں آج بھی خیام و حافظ کے دیار
آج بھی اٹھتی ہے خاکِ قرطبہ سے اک پکار

آج بھی بکتا ہے بازاروں میں یوسف کا جمال
آج بھی اے مصر تیرے نیل کا پانی ہے لال

طغرل و سنجر کی تیغیں آج بھی پیتی ہیں خوں
آج بھی انسانیت ہے وقت کا صیدِ زبوں

اک دہکتا خطِ ہستی کھینچتا جاتا ہے وقت
خونِ آدم سے زمیں کو سینچتا جاتا ہے وقت

جذباتِ دل شاہجہانپوری :-

مرا حال تھا جہاں تک وہ ادا کیا زباں سے
جو کہیں گے اشکِ رنگیں وہ الگ ہے داستاں سے

کہاں تھے جلوہ آرا کون تھا کہئے تو کیا کہئے
کہ اپنی ہر نظر اک داستاں معلوم ہوتی ہے

ہمیں یہ دیکھنا تھا وقتِ گریہ،
کہ دامن میں ہے گنجائش کہاں تک

نظروں کا سہارا کوئی نہیں پہونچوں بھی تو کیونکر منزل تک
گھبرا کے جدھر رخ کرتا ہوں ہر نقشِ قدم مٹ جاتا ہے

ہو چکی برباد گو اے شمع پروانوں کی خاک،
ذرّے ذرّے میں ہے پنہاں اک جہانِ زندگی

پہلے رودادِ دلِ ناکام پر ہو اک نظر،
پھر جہاں سے چاہئے چاکِ گریباں دیکھئے

اس اضطراب پہ قرباں اک جہانِ سکوں
کوئی سنبھال رہا ہے تڑپ رہا ہوں میں

تا بہ لب شکوے نہ آئے تھے کہ خود ہوں منفعل
حُسن کی معصوم فطرت کو پشیماں دیکھ کر

نظر ایسے مجبور کی زندگی پر
جو ہر سانس میں کہہ گیا اک فسانہ

وہی دن شبابِ بہارِ چمن کے
وہی میری دیوانگی کا زمانہ

نہ ہوا دل کسی صورت سے بھی مانوس اے دل
گو لبھاتی رہی نیرنگیِ دنیا مجھکو

ارشد کاکوی :-

غضب ہے موسمِ گل میں خزاں کی یاد آئے
کسے ہوس تھی کہ اس طرح سے بہار آئے

کھلا یہ راز جب آئے وہ بال بکھرائے
کہ روشنی سے زیادہ حسین ہیں سائے

جسے نصیب نہیں ہے ترا تغافل بھی
وہ رہ نوردِ محبت بھلا کہاں جائے

یہ زندگی ہے تو اس زندگی سے موت اچھی
یہ روشنی ہے تو اس روشنی سے باز آئے

ترے خیال کی ضو پاشیاں معاذ اللہ
خدا کرے مہ و انجم کی لاج رہ جائے

تصورات کی مشاطگی خدا کی پناہ
طرح طرح سے انھیں جا کے ہم سنوار آئے

غمِ نشاط و نشاطِ الم کا کیا کہنا،
یہ تجربے ہیں مری زندگی کے سرمائے

نفیس قادری :-

ہزار بار اُٹھیں دل میں نور کی موجیں — جو ایک بار ترے غم سے زندگی مانگی

دل غمِ دوراں سے تھا یکسر اداس — اور پھر تم بھی مجھے یاد آ گئے

جب طریقِ عشق کے کچھ مرحلے طے ہو گئے — زندگی سود و زیاں کے راز سمجھانے لگی

وہ اضطرابِ شوق میں شدت نہیں رہی — کیا کہہ گئی یہ دل سے تری چشمِ التفات

غم و الم سے تھی معمور زندگی اپنی — ہزار شکر کہ پھر بھی تجھے بھلا نہ سکے

ہائے وہ بے کسی معاذ اللہ — جب تری یاد تک نہیں آئی

کیفی چریاکوٹی :-

یہ دھوکھا ہو نہ ہو، امید ہی معلوم ہوتی ہے — کہ مجھ کو دور سے کچھ روشنی معلوم ہوتی ہے

خدا جانے، کس اندازِ نظر سے تم نے دیکھا ہے، — کہ مجھ کو زندگی، اب زندگی معلوم ہوتی ہے

اسی کا نام، شاید زندگی نے یاس رکھا ہے — نفس کی جو کھٹک ہے آخری معلوم ہوتی ہے

ہوا ہے حُسن سے کچھ اور، عکسِ حسنِ خودداری — خموشی اُن کے ہونٹوں پر ہنسی معلوم ہوتی ہے

تصور میں ہے میرے، یوں فریبِ بزم آرائی — اندھیری رات ہے اور چاندنی معلوم ہوتی ہے

کہاں ہوں؟ کس طرف ہوں میں؟ خبر اسکی نہیں مجھکو — یہی گم گشتگی، کچھ آگہی معلوم ہوتی ہے

سرِ موجِ نفس، کشتیٔ دل کو کیا کہوں؟ کیفی ؟
اُبھرتی ہے جہاں تک، ڈوبتی معلوم ہوتی ہے

شفقت کاظمی :-

وہ توجہ وہ التفات نہیں — بات کیا ہے کہ اب وہ بات نہیں
میری محرومیاں بجا ہیں مگر — حسن پابندِ التفات نہیں
قیدِ ہستی سے چھوٹنا آساں — تیرے غم سے مگر نجات نہیں
اُن کو منظور ہے کرم نہ ستم — میری قسمت میں کوئی بات نہیں
تابہ کے انتظارِ مقدمِ دوست — فرصتِ عمر کو ثبات نہیں

یکساں ہے دلِ زار کو ازروئے محبت — الطاف کسی کا ہو کہ بیداد کسی کی
کیا میں بھی ہوں اے محوِ جفا یاد کسی کو — بیتاب جو رکھتی ہے مجھے یاد کسی کی
لاریب ترے دامِ تمنا سے نکل کر — نادم ہے بہت فطرتِ آزاد کسی کی
ایذا طلبِ عشق جو تھا شوق ہمارا — مرغوب رہی سختیِ بیداد کسی کی
جی اہلِ ہوس میں نہ لگا ہے نہ لگے گا — آئے گی بہرحال تمھیں یاد کسی کی

رسوا ہو نہ وہ محوِ جفا بھی کہیں شفقت
پہونچی ہے لبِ غیر پہ روداد کسی کی

مضطر حیدری :-

کچھ دیر بہلتا رہتا ہوں کچھ دیر مچلتا رہتا ہوں — ہر دور میں اپنے جینے کے انداز بدلتا رہتا ہوں
کیا جانے کیسی آگ ہے یہ شعلوں کا پتہ ہے اور نہ دھواں — محسوس مگر ہوتا ہے یہی جیسے کہ میں جلتا رہتا ہوں
قبضے میں اقامت ہے نہ سفر پوشیدہ اشارے ہیں رہبر — رکتا ہوں تو بس رک جاتا ہوں چلتا ہوں تو چلتا رہتا ہوں
موجوں کی روانی تیز ہوا ملاح بھی غافل اور بھنور — ایسے میں سنبھلنا مشکل ہے لیکن میں سنبھلتا رہتا ہوں

فطرت میں ازل ہی سے میری نیرنگی و ندرت ہے مضطر
افسانہ تو ہوں میں ایک مگر عنوان بدلتا رہتا ہوں

رباعیات صفیہ شمیم

شرمندہ کبھی نہ روحِ محنت ہوگی ہمت ہے تو ہر گام پہ نصرت ہوگی
اسوقت اگر تجھ سے گریزاں ہے تو ہو کل وقت کو خود تری ضرورت ہوگی

کچھ بھی نہیں زندگی میں خدمت کے سوا سوزِ دل و دردِ آدمیت کے سوا
اورنگ و نشان و چتر و مُہر و دیہیم سب ہیچ ہیں سب ہیچ محبت کے سوا

تپتے ہوئے نغموں کی نہ ہوتی ایجاد نغموں میں نہ گونجتی غموں کی روداد
برباد دلوں کو عشق کرتا نہ اگر ہوتا نہ کبھی عالمِ امکاں آباد

اب دل کی خلش کا ہو رہا ہے آغاز گل کردو یہ، فانوس اٹھا دو یہ ساز
اے نغمہ گرانِ بارگاہِ عشرت خاموش کہ ماضی کی وہ گونجی آواز

کس طور سے دیکھ جی رہا ہے انساں خود اپنے کفن کو سی رہا ہے انساں
کچھ تجھ کو بھی معلوم ہے اے ربِ جلیل انسان کا خون پی رہا ہے انساں

مطبوعات موصولہ

اور سالگرہ آتی رہی

ناول ہے شمس بمن گرامی کا جسے ساحل بک ڈپو کشن گنج بازار پورینہ نے شایع کیا ہے ــــ ضخامت ۲۳۶ صفحات ۔ قیمت دو روپیہ ۔

جناب شمس بمن گرامی کا نام میرے لئے بالکل نیا ہے اور میری نگاہ سے اب تک ان کی کوئی کتاب نہیں گزری ۔ بہ سلسلۂ تعارف جناب محشر صادقی اعظمی نے لکھا ہے " یہ کتاب کہنے کو تو ناول ہے لیکن ناول سے زیادہ سیاسی اور واقعاتی حقیقتوں کا حامل ہے " ۔ آگے چل کر انھوں نے شمس صاحب کے متعلق لکھا ہے کہ " وہ موجودہ صدی کے انقلاب پسند اور سوشلزم تحریک کے علمبردار نوجوان ہیں " ان دونوں باتوں کو اگر صحیح سمجھ لیا جائے (اور صحیح نہ ہونے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی) تو پھر کتاب و صاحبِ کتاب دونوں کے متعلق کسی مزید قیل و قال کی ضرورت باقی نہیں رہتی ۔ کیونکہ آج کل کے نوجوان فسانہ نگار جب کسان و مزدور ۔ زمیندار و سرمایہ دار کا ذکر کرتے ہیں تو ان سب کے خیال کی رفتار ایک ہی سی ہوتی ہے اور معنوی حیثیت سے ان میں بہت کم فرق ہوتا ہے ۔

شمس صاحب بھی چونکہ " سوشلزم کے علمبردار " ہیں ا[illegible] لئے کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس راہ سے ہٹ کر کچھ اور فرماتے رہ گئی زبان سو اس کے متعلق کچھ کہنا اس لئے بیکار ہے کہ اُردو ان کی زبان نہیں (جیسا کہ فاضل تعارف نگار نے ظاہر کیا ہے)

بہ حیثیت مجموعی یہ کتاب اچھی نہیں ہے تو ایسی بری بھی نہیں اور اگر کسی کے پاس وقت ہو تو کسی نہ کسی طرح اس کا پڑھنا گوارا ہو سکتا ہے ۔

غالب کی باتیں

اس کے مصنف بھی جناب شمس بمن گرامی ہیں اور تعارف کی خدمت بھی محشر اعظمی ہی نے انجام دی ہے ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جناب شمس تنہا ناول نویس ہی نہیں بلکہ نقاد بھی ہیں اور نقاد بھی اس پائے کے کہ (بقول محشر صاحب) مولانا حالی اور ڈاکٹر بجنوری کے علاوہ ہندوستان میں اگر کوئی تیسرا غالب شناس ادیب نظر آتا ہے تو وہ شمس صاحب ہیں ۔ یقیناً یہ کوئی امر محال نہیں، اور ہو سکتا ہے کہ شمس صاحب میں حضرت محشر کو یہی خصوصیت نظر آئی ہو، لیکن افسوس ہے کہ ان کے اس دعوے کی تصدیق اصل کتاب کے مضامین سے نہیں ہوتی ۔

فاضل مصنف نے سات مقالے لکھے ہیں جن میں سب سے پہلے کا عنوان غالب ہے ، دوسرے کا رازِ ہستی، تیسرے کا تخیلِ جنت، چوتھے کا پند و نصایح، پانچویں کا تصورِ فنا، چھٹے کا غالب سرور کائنات کے حضور میں اور ساتویں کا چند گھنٹے غالب کے ساتھ ــــ اور ایک سو دس صفحات کی مختصر کتاب میں انھیں عنوانات کو سامنے رکھ کر غالب کی انفرادیت کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔

غالب اور غالبیات اتنا پامال اور فرسودہ موضوع ہے کہ اول تو اس پر قلم اُٹھانا ہی کوئی معنی نہیں رکھتا اور اگر کوئی شخص اس کی جرأت کرے بھی تو بحث و گفتگو کا کوئی دلچسپ پہلو نکالنا آسان بات نہیں، تاہم چونکہ شمس صاحب

کی یہ کتاب غالب کے حضور میں خراج عقیدت کی حیثیت رکھتی ہے اور تحفہ کی چیز کو نہ رد کیا جاتا ہے، نہ اس کے اچھے برے ہونے پر اظہار خیال، اس لئے امید ہے کہ لوگ اسے پڑھیں گے اور اس سے بالکل خالی الذہن ہو کر پڑھیں گے کہ اس میں کیا لکھا ہے اور کس نے لکھا ہے - قیمت ۸/ - ملنے کا پتہ :- ساحل بک ڈپو - کشن گنج پورینا -

اصطلاحات معاشیات تالیف ہے جناب پروفیسر دلشاد کلانجوی ام - اے کی، جسے دانشکدۂ بھاولپور نے کافی اہتمام کے ساتھ مجلد شایع کیا ہے - قیمت سوا روپیہ -

کتاب کے نام سے موضوع ظاہر ہے اور موضوع کی اہمیت کے متعلق کچھ لکھنا بے کار - کیونکہ اس وقت دنیا کا سب سے زیادہ مہتم بالشان مسئلہ جس پر انسان کی نجات منحصر ہے، معاشیات ہی کا مسئلہ ہے -

اردو میں اس موضوع پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں اور لکھی جارہی ہیں، لیکن ضرورت کے لحاظ سے پھر بھی کم ہیں - علوم و فنون کی کتابیں لکھتے وقت یہ خیال رکھنا اشد ضروری ہے کہ جہاں تک ممکن ہو انھیں نہایت سہل و سادہ زبان میں لکھا جائے تاکہ عوام بھی انھیں سمجھ سکیں اور فاضل مصنف نے غالباً اسی مقصد کو سامنے رکھ کر یہ کتاب پیش کی ہو اس میں معاشیات کی تمام مروجہ انگریزی اصطلاحات کا اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے اور اسی کے ساتھ ان کے مفہوم و مطلب کو بھی نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے - اس کتاب کو طلبہ کے لئے تو خیر مفید ہونا ہی چاہئے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ عام ذہن انسانی کے لئے بھی کم مفید نہیں اور اس لئے ہمیں امید ہے کہ علمی و غیر علمی دونوں حلقوں میں اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا -

گریہ و تبسم مجموعہ ہے محترمہ صفیہ شمیم ملیح آبادی کی رباعیات کا جسے خود انھوں نے بہت اہتمام سے شایع کیا ہے اور دو روپیہ آٹھ آنے میں، ۹۳ - مارگلا لائنز راولپنڈی سے مل سکتا ہے - شروع میں جوش ملیح آبادی، جگر مراد آبادی اور میاں بشیر احمد مدیر ہمایوں کی رائیں تعارف و پیش لفظ کی حیثیت سے درج کی گئی ہیں اور اسکے بعد رباعیات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو صفحہ ۸۹ تک چلا گیا ہے -

اس مجموعہ میں غالباً ۱۰۰ سے زیادہ رباعیاں ہیں اور سب کی سب اتنی اچھی ہیں کہ انتخاب کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا -

شمیم کی رباعیاں ملک کے اکثر جرائد و رسایل میں شایع ہوتی رہتی ہیں اور ارباب ذوق ان سے کافی لطف اٹھاتے ہیں - رباعی بڑی مشکل صنف سخن ہے اور یہ ہر شاعر کا کام نہیں کہ وہ فنی پابندیوں کے ساتھ صرف چار مصرعوں میں کسی اہم بات کو پوری تکمیل کے ساتھ کہہ سکے - لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شمیم کو قدرت کی طرف سے رباعیاں کہنے کی خاص اہلیت عطا ہوئی ہے اور اسی لئے انھوں نے اس ودیعت سے فایدہ اٹھاکر اکثر و بیشتر رباعیاں ہی کہی ہیں اور مشق سے ان میں استادانہ رنگ پیدا ہوگیا ہے -

ان کی چند رباعیاں نگار کی اس اشاعت میں بھی درج ہیں ان کو پڑھکر قارئین نگار اس مجموعہ کی اہمیت کا اندازہ کر سکتے ہیں -

چنگ و آہنگ مجموعہ ہے جناب عرش ملسیانی کی غزلوں اور نظموں کا جسے مرکز تصنیف و تالیف نکودر (جالندھر) نے مجلد شایع کیا ہے - قیمت تین روپیہ ضخامت ۲۳۰ صفحات -

جناب عرش کا ایک مجموعۂ نظم "ہفت رنگ" کے نام سے پہلے شایع ہوچکا ہے - اس کی ترتیب میں وہ حال سے ماضی کی طرف گئے ہیں اس لئے یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ یہ مجموعہ ۵۲ء سے ۳۶ء تک کے کلام پر مشتمل ہے -

انھوں نے پہلا دور ۲۶ء سے ۳۵ء تک قرار دیا ہے، دوسرا ۳۶ء سے ۴۵ء تک اور تیسرا ۴۶ء سے ۵۲ء تک۔ اس مجموعہ میں غزلوں اور نظموں کے علاوہ رباعیاں اور گیت بھی پائے جاتے ہیں۔ جناب عرش بڑے ذہین و پختہ کار شاعر ہیں اور جس موضوع پر انھوں نے قلم اٹھایا ہے اس کے کسی پہلو کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑے وسیع الخیال انسان ہیں اور انسانیت کا بڑا درد اپنے دل میں رکھتے ہیں۔ وہ اظہار خیال میں بھی کافی احتیاط سے کام لیتے ہیں اور کہنے کا انداز بھی دلنشین ہے ان کی غزلیں بڑی صاف و پاکیزہ ہیں، نظمیں نہایت موثر و دلکش اور رباعیاں بڑی سبق آموز۔

پوسٹ مارٹیم مجموعہ ہے جناب عرش ملسیانی کے فکاہی مضامین کا۔ جسے مرکز تصنیف و تالیف نکودر (جالندھر) نے شایع کیا ہے، ضخامت ۱۲۸ صفحات۔ قیمت ۱۲/

اس مجموعہ میں جناب عرش ملسیانی کے ۱۵ مقالے شامل ہیں جو مختلف ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر ہو چکے ہیں اس مجموعہ کا نام انھوں نے پوسٹ مارٹیم اس لئے رکھا ہے کہ اس میں انھوں نے طنز و مزاح سے کام لیکر اشخاص و حالات پر انتقاد کیا ہے۔

مجموعہ دلچسپ ہے اور بعض مقالے بہت پر لطف ہیں۔

گلشن ترجمہ ہے جناب کشور ساہو کے افسانوں کے مجموعہ "ٹیسو کے پھول" کا، جسے ہندوستان چترا چمبور بمبئی نے خاص اہتمام سے شایع کیا ہے، ضخامت ۲۲۴ صفحات۔ قیمت تین روپیہ۔

کشور ساہو، دنیائے فلم میں ڈائرکٹر و پروڈیوسر کی حیثیت سے خاص شہرت رکھتے ہیں، لیکن یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ وہ ادیب و فسانہ نگار بھی ہیں۔

اس مجموعہ میں ان کے بارہ افسانے شامل ہیں جو فنی خصوصیات کے لحاظ سے بڑے کامیاب فسانے ہیں ہر فسانہ نگار کامیاب فلم ڈائرکٹر نہیں ہوسکتا، لیکن ایک فلم ڈائرکٹر اگر اچھی فسانہ نگاری اختیار کرے تو اس کی کامیابی زیادہ یقینی ہے۔

اس مجموعہ کے افسانے بیان و زبان، لب و لہجہ اور کردار نگاری کے لحاظ سے بہت کامیاب افسانے ہیں اور ہمیں امید ہے کہ لوگ انھیں بہت دلچسپی سے پڑھیں گے۔

ماہ و انجم مجموعہ ہے جناب نثار اٹاوی کی رباعیوں اور غزلوں کا جسے مکتبۂ شانِ ہند دہلی نے خاص اہتمام سے شایع کیا ہے۔ ضخامت ۱۳۶ صفحات۔ قیمت ۱۲/

ابتدا میں جناب اثر لکھنوی کا پیش لفظ ہے اور اس کے بعد جناب ضیاء بدایونی کا مقدمہ اور ان دونوں حضرات نے ان کے شاعرانہ ذوق کی پوری داد دی ہے۔

جناب نثار جدید طبقۂ شاعری سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن ان کی شاعری کا ٹکنک اور پس منظر جدید نہیں ہے زمانہ کے موجودہ رجحانات سے وہ یقیناً متاثر ہیں، جن کا ثبوت ان کے کلام سے ملتا ہے، لیکن چونکہ بہ اتباع اساتذۂ قدیم وہ فن سے منحرف ہوکر شعر کہنا پسند نہیں کرتے، اس لئے ان کے کلام میں ترنم و نغمہ کی بھی کمی نہیں۔

ان کے خیالات بہت پاکیزہ ہیں اور طرزِ ادا نہایت دلکش، ان کی رباعیوں میں چونکا دینے والی باتوں اور غزلوں میں تڑپا دینے والے اشاروں کی کمی نہیں۔

مثنوی مظہر العجائب

ترجمہ ہے شیخ فرید الدین عطار کی فارسی مثنوی مخزن الغرائب کا جسے سید شاہد صاحب نے نہایت اہتمام کے ساتھ پاکستان منزل لارنس روڈ کراچی سے شایع کیا ہے۔ ضخامت ۳۹۲ صفحات۔ قیمت آٹھ روپیہ۔

مخزن الغرائب، شیخ عطار کی مشہور مثنوی ہے، لیکن بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ تصنیف ان کی نہیں ہے۔ جناب شاہد نے سب سے پہلے تقریباً ۱۰۰ صفحات میں اسی مسئلہ پر بحث کی ہے اور مختلف و متعدد شواہد و دلایل سے اس خیال کی تردید کی ہے۔

اس کتاب میں ایک صفحہ پر اصل فارسی مثنوی کے اشعار درج کئے گئے ہیں اور اس کے مقابل دوسرے صفحہ پر منظوم ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ ترجمہ بہت صاف و سلیس ہے اور یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ ترجمہ ہے۔

تاریخ صحافت اُردو جلد اول

تصنیف ہے جناب امداد صابری کی جسے سوبھاش بک ڈپو دہلی نے شایع کیا ہے ضخامت ۴۰۴ صفحات۔ قیمت تین روپیہ۔

اس وقت تک "اُردو ادب" کی متعدد تاریخیں لکھی جاچکی ہیں، لیکن "صحافت اُردو" کا کوئی تذکرہ شایع نہیں ہوا، حالانکہ "اُردو ادب" کی کوئی تاریخ کمل ہو ہی نہیں سکتی، جب تک اس موضوع کو اس میں شامل نہ کیا جائے۔

جناب صابری نے سب سے پہلے تاریخ ہند کی خبر رسانی پر ایک بڑا مفید و دلچسپ تبصرہ کیا ہے جو عہد منو سے لیکر وقت حاضر تک پورے زمانہ پر محیط ہے اور اس کے بعد بعض قدیم انگریزی، بنگالی و گجراتی اخباروں کا ذکر کرکے اُن اُردو فارسی رسایل و جراید کی تاریخ پیش کی ہے جو غدر ۱۸۵۷ء تک جاری رہے تھے۔ انھوں نے اس سلسلہ میں سب سے پہلے اخبار "جام جہاں نما" کا ذکر کیا ہے جو ۱۸۲۲ء میں اُردو فارسی دونوں زبانوں میں کلکتہ سے شایع ہوتا تھا اور آخری اخبار طلسم حیرت کو قرار دیا ہے جو ۱۸۵۷ء میں مدراس سے شایع ہوتا تھا۔

انھوں نے اس کتاب میں ایک سو اخبارات و جراید کا ذکر کیا ہے اور ہر ممکن تحقیق سے کام لیا ہے۔ انھوں نے متعدد قدیم اخباروں کے چربے بھی پیش کئے ہیں اور ان کی تحریر کے نمونے بھی دئے ہیں جن سے بعض نہایت اہم تاریخی واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ جناب صابری نے یہ کتاب لکھ کر زبان کی بڑی گرانقدر خدمت انجام دی ہے اور جس محنت و کاوش سے انھوں نے یہ خدمت انجام دی ہے اس کی صحیح داد دینا الفاظ سے ممکن نہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ ملک ان کی اس جدو جہد کی پوری قدر کرے گا تاکہ صابری صاحب اس کی دوسری جلد بھی جلد شایع کرسکیں۔

فطری علاج

تصنیف ہے حسن الدین احمد صاحب حیدر آبادی کی جسے خود انھوں نے شایع کیا ہے اور ڈھائی روپیہ میں، عزیز باغ، سلطان پورہ حیدر آباد دکن سے مل سکتی ہے۔ فطری طریق علاج اس لحاظ سے نیا نہیں کہ وہ کوئی جدید دریافت ہے کیونکہ زمانۂ قدیم میں زیادہ تر اسی کا رواج ہے، لیکن اس لحاظ سے ضرور نیا ہے کہ لوگوں نے اسے بھلا دیا تھا اور اب پھر دُنیا اسکی طرف متوجہ نظر آتی ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے پہلے فطری علاج کے فلسفہ پر علمی انداز میں گفتگو کی ہے اور پھر اسکے ابتدائی اصول پیش کرکے فطری علاج کے تمام طریقوں پر گفتگو کی ہے۔ ان تمام طریقوں پانی کا علاج (جو لوئی کہنی سے منسوب ہے) ہومیوپیتھی (جس کا موجد ہنی من تھا) خصوصیت کے ساتھ بہت اہمیت رکھتے ہیں اور مصنف نے ان پر زیادہ زور دیا ہے۔ اسی کے ساتھ غذا اور ورزش کے متعلق جو ہدایات درج کی گئی ہیں وہ بھی غور سے پڑھنے کے قابل ہیں، کتاب فی الجملہ بہت مفید ہے اور ہمیں امید ہے کہ لوگ اس کے مطالعہ سے مستفید ہوں گے۔

مکتوبات نیاز

(تین حصوں میں)

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشاء میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں ان اڈیشنوں میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کیا گیا ہے اور ۲۰ پونڈ کے کاغذ پر طباعت ہوئی ہے قیمت ہر حصہ کی چار روپیہ علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اسکی زبان تخییل اسکی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط ہے

قیمت دو روپیہ

علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے۔ اردو میں بھی یہ پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے جس میں ہندی شاعری کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں:۔

(۱) چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

(۲) مادئین کا مذہب

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت

ایک روپیہ

علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اسقدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اسکی نظیر نہیں مل سکتی۔ تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوشخط، سرورق رنگین

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری۔ اسکے مطالعہ سے ایک شخص انسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت، عروج و زوال، موت و حیات صحت و بیماری، شہرت و نیک نامی پر صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ

علاوہ محصول

نقاب اٹھ جانیکے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیان طریقت و علمائے کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت اجتماعی حیات کیلئے کس درجہ سم قاتل ہے۔ زبان، پلاٹ و انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کر دینا آخر تک پڑھ لینا ہے یہ بھی جدید اڈیشن ہے جس میں صحت اور نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت

ایک روپیہ آٹھ آنے

علاوہ محصول

انتقادیات

حضرت نیاز کے انتقادی مقالات کا مجموعہ فہرست مضامین یہ ہے ایران و ہندوستان کا اثر جرمن شاعری پر، فارسی زبان کی پیدائش پر مورخانہ نظر اردو شاعری پر تاریخی تبصرہ۔ اردو غزلگوئی کی عہد بہ عہد ترقی نقشہائے رنگ رنگ غالب کی فارسی غزل گوئی پر تبصرہ ادبیات اور اصول نقد فنون ادبیہ حقیقت نگاری

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآراء مقالہ جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور دنیا میں یہ کیونکر رائج ہوا۔ اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کرسکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے

قیمت

ایک روپیہ

علاوہ محصول

نگار کے خاص نمبر

سالنامہ ۱۹۲۸ء

(مومن نمبر) جو ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ تھی دوبارہ شایع کیا گیا ہے مومن کے مطالعہ کیلئے اس کا پڑھنا از بس ضروری ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری ۱۹۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

فروری - مارچ ۱۹۴۶ء

جو فن انتقاد و پر ملک کے بہترین اہل قلم اور ارباب فکر کے [illegible] مضامین پر مشتمل ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری ۱۹۴۸ء

(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقایق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور زرین کو نہ بھول جائے جس پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قایم ہوئی تھی۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری ۱۹۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے شایع کئے گئے ہیں۔ اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اسکے مطالعہ سے بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسکول ہیں اور ہر اسکول کا معیاری فسانہ کیسا ہونا چاہیئے قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری ۱۹۵۰ء

نگار کی ۳۰ سالہ ادبی و تنقیدی خدمات کا نچوڑ جس میں ۱۹۲۲ء سے لیکر ۱۹۴۹ء تک کے تمام تنقیدی رجحانات و انتقادی نمونوں کو واضح کیا گیا ہے اس میں بعض ایسے اکابر شعرا کا تذکرہ و انتخاب کلام بھی شامل ہے جن کے حالات عام طور پر معلوم نہیں ہیں اور جن کا کلام نایاب ہے۔ اس میں جدید تنقیدی میلانات اور ترقی پسند نقادوں کے مقالات بھی شامل ہیں۔

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری ۱۹۵۱ء

اس سالنامہ کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں مارس ہنڈس کی مشہور عالم کتاب "ایک مستقبل کی تلاش" کا ترجمہ و اقتباس ہے جس میں اس نے ایران، مصر، عراق، فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاحت کے بعد وہاں کی موجودہ اقتصادی زبوں حالی اور ان کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ ان کا مستقبل کتنا روشن ہے اگر وہ ترقی کے صحیح راستہ کو جان لیں۔ سالنامہ کا دوسرا حصہ اڈیٹر نگار کے قلم کا ہے جس میں پہلی جنگ کے بعد مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور اسکے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے۔ قیمت دو روپیہ

۵۵ سال کے بعد

یہ کتاب نفسیات عملی پر اتنا مفید دلچسپ لٹریچر ہے کہ آپ اسکو ایکبار ہاتھ میں لینے کے بعد اسوقت تک چھوڑ ہی نہیں سکتے جب تک ختم نہ کرلیں۔ یہ کتاب آپ کو بتائے گی کہ "زندہ رہنا بھی ایک فن ہے"

قیمت ایک روپیہ بارہ آنے

سالنامہ ۱۹۵۲ء

(حسرت نمبر) جس میں ملک کے تمام [illegible] نقد و تبصرہ کیا ہے۔ اور انتخاب کلام حسرت اس انداز سے کیا گیا ہے کہ آپ کو کلیات حسرت دیکھنے کی ضرورت نہ ہوگی حسرت کی شاعری کا مرتبہ معلوم کرنے کیلئے اس کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ ۱۹۵۳ء

(داغ نمبر) جس میں داغ کے سوانح حیات کے بہت سے وہ پہلو پیش کئے گئے ہیں جو اس وقت تک سامنے نہ آئے تھے، اس نمبر میں قیام رامپور، قیام [illegible]